عَلَيْكُمْ أَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَنْ ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ

طلوعِ اسلام

فروری ۱۹۳۹

ایک روپیہ

مرتب
محمد یونس

طلوع اسلام
کراچی

بدل اشتراک
سالانہ دس روپے
ششماہی چھ روپے
خرچ رجسٹری سالانہ تین روپے

جلد ۲ | کراچی .... فروری سنہ ۱۹۴۹ء | نمبر ۲

فہرست

۱	لمعات	.. ..	۱ — ۸
۲	بقیہ لمعات	.. ..	۷۵
۳	(ا) استصواب کشمیر	.. ..	..
۴	(ب) انتخابات پنجاب	.. ..	..
۵	تلمیحات اقبال	محترم پرویز صاحب	۹
۶	حکومت اور مملکت	.. ..	۱۴
۷	باب المراسلات	.. ..	۱۸
۸	اسلامی جماعت	.. ..	..
۹	پاکستان مسلم لیگ	.. ..	۲۳
۱۰	معارف القرآن	.. ..	۳۳
۱۱	اسلام کا نظریہ جہاد	محترم حکیم حیدر زمان صاحب صدیقی	۴۶
۱۲	بشارت (نظم)	مبصر یزدانی صاحب از ایبٹ آباد	۵۶
۱۳	یہ ہندوستان ہے	.. ..	۵۷
۱۴	ہاری رپورٹ سندھ	حارث	۶۳
۱۵	(بقیہ لمعات)	.. ..	۷۵—۸۰

لمعات

استصوابِ کشمیر

حفاظتی کونسل نے ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کو ایک قرارداد کی رو سے پانچ ارکان پر مشتمل کمیشن کی تشکیل کا اعلان کیا جو پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں کو کشمیر میں جنگ بند کرنے اور استصواب کے لئے تیاری کرنے پر آمادہ کرے۔ دونوں حکومتوں سے مذاکرات کے بعد کشمیر کمیشن نے ۱۳ اگست کی قرارداد پیش کی جو ستمبر میں اخبارات میں شائع ہوئی۔ یہ قرارداد تین حصوں میں منقسم تھی۔ پہلا حصہ التوائے جنگ سے متعلق تھا جس کا ملخص یہ تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کی حکومتیں یہ تجاویز منظور کرتے ہی باہمی طور پر کوئی تاریخ مقرر کریں اور بروقت احکام صادر کردیں تاکہ تمام افواج مقررہ تاریخ کو لڑائی یک قلم بند کردیں۔ اس کے بعد جانبین کسی طرح افواج میں اضافہ نہ کریں۔ جانبین کی فوجی ہائی کمانیں افواج کے موجودہ مقامات تعین پر کوئی مقامی تبدیلی کرنا چاہیں تو باہمی مشاورت سے ایسا کرلیں۔ کمیشن حسب ضرورت ومنشا عسکری مبصرین مقرر کرے گا تاکہ فیصلہ التوائے جنگ پر مکمل عمل درآمد کی نگہداشت ہوسکے۔

قرارداد کا دوسرا حصہ متارکہ سے متعلق تھا۔ اس کی رو سے پاکستان کو ریاست کشمیر کی حدود سے اپنی جملہ افواج واپس بلا لینے پر رضامند ہونا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی یہ ذمہ داری بھی تھی کہ وہ ان قبائلیوں اور پاکستانیوں کو جو ریاست کشمیر میں بغرضِ جنگ موجود ہیں ریاست سے نکلوانے کی کوشش کرے۔ اس طرح جو علاقہ خالی ہوگا اس کے انتظام کے ذمہ دار "مقامی حکام" زیرِ نگرانی کمیشن ہوں گے۔ جب پاکستان یہ کہے گا کہ محارب قبائلی اور پاکستانی ریاستی حدود سے نکل گئے ہیں اور پاکستانی افواج کا انخلا بھی ہو رہا ہے، اس وقت ہندوستان کمیشن سے طے کئے ہوئے طریقے اور رفتار کے مطابق اپنی افواج کا معتدبہ حصہ ریاست سے نکالنا شروع کرے گا۔ قطعی معاہدہ کی شرائط تسلیم ہوجانے تک حکومت ہندوستان التوائے جنگ کے وقت کے عسکری خطوط میں اسی قدر فوجیں رکھے گی جو مقامی حکام کو امن قائم رکھنے میں مدد دینے کیلئے ضروری ہوں۔ حکومتِ ہندوستان اس کی ضامن ہے کہ ریاست جموں اور کشمیر کی حکومت اعلان کرے گی کہ وہ امن وقانون نیز جملہ انسانی وسیاسی حقوق کی محافظ ہوگی۔

قرارداد کا تیسرا حصہ ریاست کے مستقبل سے متعلق تھا۔ اس میں تحریر تھا کہ حکومت ہائے ہندوستان وپاکستان اس خواہش کا اعادہ کرتی ہیں کہ ریاست جموں وکشمیر کے مستقبل کا فیصلہ باشندوں کی منشا کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں دونوں حکومتیں کمیشن سے مذاکرات پر تیار ہیں تاکہ ایسی منصفانہ وعادلانہ شرائط کا تعین ہوسکے جس سے باشندگانِ جموں وکشمیر کی آزادانہ رائے دہی کا انتظام ہوسکے۔

اس قرارداد کو ہندوستان نے اپنی توجیہوں کے ساتھ "منظور" کرلیا۔ یہ توجیہیں مندرجہ ذیل تھیں:

(۱) کمیشن جموں اور کشمیر کے سارے علاقہ پر مہاراجہ کا اقتدار تسلیم کریگا۔

(۲) جب لداخ کو پاکستان خالی کردے گا تو اس کا انتظام وانصرام ریاست کے سپرد ہوجائے گا۔

۳) حکومت پاکستان کو استصواب کے انعقاد و انتظام نیز ریاست کے اندرونی امور میں کچھ دخل نہیں ہوگا۔
۴) کمیشن پوری طرح اعتراف کرے کہ ریاست کو بیرونی حملوں اور اندرونی بدنظمی سے بچانا اشد ضروری ہے اور یہ ذمہ داری حکومتِ ہندوستان کی ہوگی۔

ان توجیہوں پر سرسری نظر ڈالنے سے ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ہندوستان عادلانہ استصواب سے بہ لطائف الحیل پہلوتہی کر رہا تھا۔ ایک تو یوں بھی اس قرارداد میں استصواب کا ذکر نہیں تھا، لیکن ہندوستان حکومتی انتظام کے بہانہ سے آزاد کشمیر اور پاکستان کو جموں اور کشمیر میں مکمل طور پر بے دخل کرکے اپنا تسلط قائم کرنا چاہتا تھا تاکہ جو کچھ وہ جنگ سے حاصل نہیں کر سکا اسے گفتگوئے مصالحت و مفاہمت سے حاصل کرلے۔

ہندوستان کے غلبہ و تسلط کے سایہ میں رائے شماری کا نتیجہ ظاہر ہے! قرارداد نے ہندوستان کو بہت حد تک کشمیر میں برتری عطا کر دی تھی لیکن ہندوستان رہی سہی کسر بھی پوری کر لینا چاہتا تھا۔

پاکستان شروع سے ہی اس کا داعی تھا کہ ریاست کا مستقبل باشندگان ریاست کے ہاتھ میں ہے۔ مستقبل سے متعلق فیصلہ کا حق انھیں اور صرف انھیں حاصل ہے۔ کسی قسم کا فیصلہ خواہ وہ پاکستان کی طرف سے ہو، خواہ ہندوستان کی طرف سے، ان پر مسلط نہیں کرنا چاہئے۔ لہٰذا ایسی پرامن فضا قائم ہونی چاہئے جس میں اہالیان ریاست بے خوفی اور آزادی سے اپنی رائے دے سکیں۔ اور یہ فیصلہ کرسکیں کہ انھیں پاکستان سے الحاق منظور ہے یا ہندوستان سے۔ اس برحق داعیہ کی تکمیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ ہندوستان، جو کہ فریق مقدمہ ہے، کا ملاً امور ریاست پر قابض نہ ہو جائے، ورنہ آزاد استصواب کا تصور باطل ہو جائے گا۔ چنانچہ پاکستان نے کمیشن پر واضح کیا کہ ان کا قدم اول یہ ہونا چاہیے کہ جنگ کشمیر ملتوی ہو جائے اور ایسا پرامن ماحول پیدا ہو جائے کہ اس میں استصواب کے عملی پہلو کا تصفیہ ہو سکے۔ یہ ایک منصفانہ اور سیدھا سادا مطالبہ تھا، لیکن کمیشن کی قرارداد میں معاملہ کی اس سادگی اور وضاحت کا اعتراف مفقود تھا۔ ہندوستان کی توجیہوں نے اسے اور الجھا دیا۔ چنانچہ پاکستان نے کمیشن سے درخواست کی کہ وہ غیر مشروط التوائے جنگ کا فیصلہ کرے، اور اس سے پیدا ہونے والی پرامن فضا میں استصواب کا اوقات نامہ تیار کیا جائے؛ اور اگر کمیشن، ایسا کرنے سے قاصر ہے تو چونکہ متارکہ اور مستقبل سے متعلق تصفیہ لازم و ملزوم ہیں اس لئے اگر کمیشن متارکہ کی شرط (یعنی قرارداد کا حصہ دوئم) منظور کراتا ہے تو اسے چاہئے کہ قرارداد کے حصہ سوئم متعلقہ مستقبل ریاست کی وضاحت کردے تاکہ استصواب کی اساسات منظرعام پر آجائیں۔ حکومتِ پاکستان نے قرارداد کو نامکمل اور مبہم قرار دیتے ہوئے اس عمومی شرط کے ساتھ اسے قبول کر لیا کہ حکومت ہندوستان مجلس تحفظ کی قرارداد ۲۱ اپریل (سنہ ۱۹۴۸ء) کی شرائط متعلقہ آزادانہ و منصفانہ استصواب ضرور منظور کرے۔ حکومتِ ہندوستان کی محولہ بالا توجیہوں اور قرارداد کے ابہام کے پیش نظر یہ عمومی شرط ازحد ناگزیر تھی۔ حکومت پاکستان نے کمیشن کو مبہم تجاویز کی تفاصیل کیلئے بھی لکھا۔

ہندوستان کی توجیہیں قرارداد کے منافی تھیں، لہٰذا ہندوستان کا یہ دعویٰ کہ اس نے قرارداد کو تسلیم کر لیا ہے، بے بنیاد تھا۔ کمیشن اس لفظی تسلی کے بعد پیرس چلا گیا، کیونکہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سلسلہ میں اس کی وہاں ضرورت

تھی۔ معاملہ بہرنوع، حکومت ہائے پاکستان و ہندوستان اور کمیشن کے مابین زیر بحث رہا، تا آنکہ ۳۱ر دسمبر اور یکم جنوری کی درمیانی شب کو کراچی اور نئی دہلی سے ایک ہی مضمون کے اعلامیے شائع ہوئے کہ کشمیر میں لڑائی ۳۱ر دسمبر کی شب کو بارہ بجکر انسٹھ منٹ پر ختم ہو جائے گی۔ کمیشن نے یہ سالِ نو کا تحفہ اقوامِ متحدہ کی مجلسِ تحفظ کو پیش کیا۔ نوعیت کے اعتبار سے یہ فی الواقعہ سالِ نو کا تحفہ تھا۔ کرۂ ارض کے متعدد منتشر محاذاتِ جنگ سے کم از کم ایک محاذ پر سے تو التوائے جنگ کی خبر آئی۔ بالآخر ۵ر جنوری کی تجاویز منصۂ شہود پر آئیں جو ۱۳ر اگست کی قرارداد کا حصہ اور تشریح ہیں۔ ان تجاویز کا مضمون یہ تھا:

i) جموں و کشمیر کا ہندوستان یا پاکستان سے الحاق آزادانہ استصواب کے جمہوری طریق سے فیصل ہوگا۔

ii) جب کمیشن کو اطمینان ہو جائیگا کہ ۱۳ر اگست کی قرارداد کے حصص اول و دوم (التوائے جنگ اور تارکہ) پر کما حقہٗ عمل درآمد ہو گیا ہے اور استصواب کے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں، اسوقت استصواب برپا ہوگا۔

iii) اقوامِ متحدہ کا سکرٹری جنرل کمیشن کی منظوری سے کسی ایسے اعلیٰ بین الاقوامی حیثیت رکھنے والے صاحب کو ناظم استصواب نامزد کرے گا جسے عمومی اعتماد حاصل ہوگا۔ اس ناظم کا رسمی تقرر حکومت جموں و کشمیر کرے گی۔

iv) ناظم استصواب ریاست جموں و کشمیر سے وہ اختیارات "حاصل" کریگا جو آزادانہ استصواب کے لئے ضروری ہوں۔ اسے حسبِ ضرورت معاونین و مبصرین مقرر کرنے کے اختیارات ہوں گے۔

v) قرارداد ۱۳ر اگست کے حصص اول و دوم پر عمل درآمد ہو چکنے کے بعد جب کمیشن کو اطمینان ہو جائیگا کہ حالات پرامن ہو گئے ہیں، تو کمیشن حکومتِ ہندوستان کے مشورے سے یہ طے کریگا کہ آخر کار ریاستی اور ہندوستانی مسلح فوجوں کا کیا انجام ہو۔ یہ فیصلہ ریاستی حفاظت اور آزادی استصواب کے تقاضوں کے پیشِ نظر کیا جائیگا۔

آزاد کشمیر کی افواج کا انجام کمیشن، ناظمِ استصواب اور "متعلقہ حکام" کی مشاورت سے فیصل ہوگا۔ ہندوستان اور آزاد کشمیر کی افواج سے متعلق یہ آخری فیصلے اس وقت ہوں گے جبکہ التوائے جنگ اور تارکہ پر عمل درآمد ہو چکا ہوگا یعنی پاکستان کی ساری اور ہندوستان کی معتدبہ فوجیں ریاست سے نکل چکی ہوں گی۔ یہ فیصلہ جانبین سے متعلق ہوگا اور اس کا اطلاق جانبین پر ہوگا۔

اس کے بعد ان تحفظات و مراعات کا ذکر ہے جو استصواب کے سلسلہ میں حاصل ہوں گے۔ مثلاً

i) جو لوگ ریاستی حدود میں ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد جائز ضروریات کے علاوہ آئے اور بدستور موجود ہیں، انھیں ریاست سے نکلنا پڑے گا۔

ii) سیاسی قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔

iii) اقلیتوں کا تحفظ ہوگا۔

iv) سیاسی حقوق کا تحفظ ہوگا، سیاسی پروپیگنڈے کی اجازت ہوگی، آمد و رفت، تحریر اور تقریر کی آزادی ہوگی، وغیرہ

استصواب کے خاتمہ پر ناظمِ استصواب یہ تصدیق کریگا کہ استصواب حسبِ خواہ آزادانہ ہوا ہے۔

حکومت پاکستان نے ۲۰ر جنوری کو ایک اعلامیہ میں ان تشریحات کو شائع کر دیا جو کمیشن نے ان تجاویز سے متعلق بہم پہنچائیں اور جن کی روشنی میں اور اساس پر پاکستان نے ان تجاویز کو منظور کیا۔ اس حقیقت کو خصوصیت سے ملحوظ

رکھنا چاہیے کہ ۱۳ اگست اور ۵ جنوری کی قراردادیں اور کمیشن کی تشریحات مل کر ایک 'وحدت' بنتی ہیں۔ تجاویز کا خاکہ ان سب دستاویزات کو ملانے سے ہی پورا ہوتا ہے۔ ان دستاویزات کے مطالعہ سے مندرجہ ذیل امور نکھر کر سامنے آتے ہیں:۔

۱) فیصلہ پیش نظر کے تین مراحل ہیں۔ پہلا مرحلہ التوائے جنگ ہے، جس پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔ دونوں حکومتوں نے لڑائی بند کر دی ہے اور جانبین کی فوجیں ۳۱ دسمبر ۱۹۴۸ء رات کے بارہ بجکر انسٹھ منٹ پر جہاں تھیں وہیں "جامد" و ساکن ہو گئی ہیں۔ دونوں ممالک کی فوجیں ہائی کمانیں باہمی مشاورت کر رہی ہیں اور ضروری جزئیات طے ہو رہی ہیں۔

۲) دوسرا مرحلہ متارکہ ہے۔ اس سلسلہ میں کمیشن کا عسکری مشیر اور عسکری مبصرین عنقریب یہاں پہنچ رہے ہیں۔ ان کے آنے پر متارکہ کی وہ تفاصیل طے ہونگی جن کے مفہوم میں ہنوز ابہام پایا جاتا ہے۔ متارکہ کے محکمات میں سے یہ ہیں:۔

ا) ریاست سے پاکستان کی تمام اور ہندوستان کی بیشتر افواج کا انخلا۔ یہ انخلا عام (ہندوستانی) خیال کے خلاف بیک وقت شروع ہوگا۔ یعنی یوں نہیں ہوگا کہ پہلے پاکستان اپنی فوجیں نکال لے اس کے بعد ہندوستان ایسا اقدام کرے۔ جو ہندوستانی فوجیں ریاست میں رہ جائیں گی ان کے متعلق کمیشن نے ضمانت دی ہے کہ وہ کم سے کم ہوں گی۔

ب) جو علاقے اس وقت پاکستان کے فوجی تصرف میں ہیں وہ آزاد کشمیر کی فوجی تحویل میں چلے جائیں گے آزاد کشمیر کی فوجیں بدستور باقی رہیں گی۔ ان کو غیر مسلح اور منتشر نہیں کر دیا جائے گا۔

ج) پاکستان ان محارب قبائلیوں اور پاکستانیوں کو، جو ریاست کے باشندے نہیں، ریاست سے نکالنے میں امکانی کوشش کرے گا۔

د) کمیشن نے جہاں "مقامی حکام" کی ترکیب استعمال کی ہے، اس سے مراد آزاد کشمیر حکومت ہے۔ آزاد کشمیر حکومت کا نام اس لئے نہیں لیا گیا کہ کمیشن نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ پاکستانی افواج جن علاقوں کو خالی کرینگی ان کا نظم و نسق آزاد کشمیر حکومت کے سپرد ہوگا۔ کمیشن اس پر نگراں ہوگا۔ یہ نگرانی ماتحتی کے مرادف نہیں ہوگی۔ کمیشن صرف اس کی نگرانی کرے گا کہ متارکہ کی پابندی ہو رہی ہے۔ گویا آزاد کشمیر حکومت ان علاقوں میں جو اس کے قبضے میں ہیں نیز ان علاقوں میں جو پاکستانی افواج کے انخلا سے اس کی تحویل میں آجائیں گی پوری طرح آزاد ہوگی۔ گلگت میں اس نگرانی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کیونکہ وہاں پاکستان کا پولیٹیکل ایجنٹ مقیم و متعین ہے۔ آزاد کشمیر کے علاقوں میں مہاراجہ کی حکومت کا مطلقاً کوئی اثر و نفوذ نہیں ہوگا، نہ اسے یہ اجازت ہوگی کہ وہ اپنے نمائندے (فوجی یا غیر فوجی) ان علاقوں میں بھیجے۔

ج) ریاست کے ہندوستانی اور آزاد کشمیری علاقوں میں امن و قانون بحال رہیں گے اور جملہ سیاسی حقوق کا تحفظ ہوگا۔

۳) تیسرا مرحلہ استصواب ہے۔ جس کی اساسات درج ذیل ہیں:

ا) استصواب ریاست جموں و کشمیر کا فیصلہ بہ حیثیت ایک وحدت کے کریگا، یعنی استصواب کے فیصلہ کا

اطلاق پوری کی پوری ریاست پر ہوگا۔ بالفاظ صحیح تر ریاست کی تقسیم خارج از بحث ہے۔

ب) استصواب کا انتظام و انصرام ناظم کرے گا جسے اقوام متحدہ کا سکرٹری جنرل کمیشن کے مشورہ سے نامزد کرے گا۔ اس نامزدگی میں حکومت ہائے ہندوستان و پاکستان سے مشورہ ضرور کیا جائے گا لیکن آخری فیصلہ سکریٹری جنرل کمیشن کے مشورہ سے کرے گا۔ ناظم کا رسمی تقرر ریاست کی طرف سے ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ ناظم ریاست کے ماتحت ہوگا۔ وہ اعلیٰ بین الاقوامی حیثیت کا مالک ہوگا اور اسے عمومی اعتماد حاصل ہوگا۔

استصواب کے انعقاد و انتظام کے سلسلہ میں ناظم جو اختیارات رسمی طور پر ریاست سے حاصل کریگا وہ (ریاست اور ہندوستان کے لئے) ایک لفظ تسلی ہے۔ ناظم جن اختیارات کو آزادانہ استصواب کے لئے ضروری سمجھے گا وہ اسے "حاصل" ہو جائیں گے۔ اس "حصول" میں اجازت و اعطا کا سوال نہیں۔ استصواب کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری تنہا ناظم کی ہوگی۔

ج) ناظم استصواب کی نامزدگی کمیشن کی تجاویز منظور ہو جانے کے بعد جتنا جلدی ممکن ہوا کر دی جائیں گی۔ اس تقرر کے جتنا جلدی بعد ممکن ہوا، ناظم مسئلہ زیر بحث کا معائنہ اور مطلوبہ عملہ کی بھرتی شروع کر دے گا۔

د) استصوابی تجاویز کو اسی وقت زیر غور لایا جا سکے گا جبکہ کمیشن کو اطمینان ہو جائے گا کہ متارکہ پر حسب خواہ عمل درآمد ہو رہا ہے۔

س) ناظم کا رسمی تقرر اور اس کی کارروائی اس وقت شروع ہوگی جب کمیشن کو اطمینان ہو جائیگا کہ ۱۳ اگست کی قرارداد کے حصص اول و دوم پر عمل درآمد مکمل ہو چکا ہے۔

ش) باقاعدہ رائے شماری اس وقت ہوگی جبکہ جملہ انتظامات استصواب مکمل ہو جائیں گے۔

بدقسمت ریاست کشمیر (وجموں) اور اس کے بدقسمت تر باشندوں کے لئے مہاراجہ کشمیر کے الحاق ہندوستان کا قزاقانہ اقدام برق ہلاکت ثابت ہوا۔ کشمیری مسلمان جو نسلاً بعد نسلٍ استبداد ملوکیت کے گرانبار اطواق و سلاسل کے نیچے دبے چلے آرہے تھے اور جن کی چیخیں مہاراجہ کی عشرت گاہوں کے نقارخانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ وقیع نہیں تھیں مرگ بے پناہ کا نشانہ ہی نہیں بنے بلکہ ان کی عزت و آبرو بھی خاک میں مل گئی۔ راشٹریہ سیوک سنگھ اور سکھ درندوں نے ہندوستانی فوج کے ابلیسی سایئے میں وہ بے پناہ مظالم توڑے کہ جبین انسانیت عرق آلود ہے۔ ہالینڈ کے انڈونیشی اقدام جارحانہ کے خلاف دہائی دینے والے نہرو کی فوجوں نے کشمیر کی جنت نظیر سرزمین میں انسانی جان اور آبرو کو اس بے رحمی سے خاک میں ملایا کہ اس کا ہدف مطاعن ہالینڈ بھی شاید اس سے سبق سیکھے۔ کشمیریوں کو بے دردی اور غایت سفاکی سے تہ تیغ کیا گیا اور علاقوں کے علاقے

خالی کرالئے گئے اور فلاکت زدہ متاع بردہ کشمیریوں کو پاکستان کی طرف دھکیل دیا گیا تاکہ پناہ گزینوں کے اس نئے سیلاب میں پاکستان بھی بہہ جائے۔ بقیۃ السیف مسلمانانِ کشمیر کثیر تعداد میں اس وقت پاکستان کی پناہ گاہوں میں پڑے ہیں، اور ان کے علاقوں میں ہندو اور سکھ آباد کر دئے گئے ہیں تاکہ اگر فوجی کارروائی ناکام ثابت ہو اور کسی وقت معاملہ استصواب پر ہی آکے رکے تو ہندوستان کے پاس ہندوستان سے برآمد کئے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کے ووٹ تیار رہیں۔ لیکن منصفانہ استصواب کے لئے ضروری ہے کہ پناہ گزینوں کو پھر سے اپنے آبائی علاقوں میں آباد کرایا جائے اور انھیں موقع دیا جائے کہ وہ اپنے آبائی وطن کے مستقبل سے متعلق رائے دہی میں شریک ہو سکیں۔ اس مسئلہ کا حل آسان نہیں۔ کیونکہ اول تو بہت سے مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے ہیں، دوسرے جو بقیۃ السیف پاکستان تک پہنچ سکے ہیں، انھیں انتہائی مجبوری کے عالم میں غیر انسانی مظالم سے تنگ آکر ترک وطن کرنا پڑا ہے۔ وہ لفظی ضمانتوں اور تسلیوں سے واپسی پر آمادہ نہیں ہو سکتے۔ ان کے لئے حقیقی امن کی ضرورت ہے۔ وہ جب تک پوری طرح محفوظ نہیں ہوں گے، واپس نہیں جائیں گے اس معاملہ کا یہ نفسیاتی پہلو قراردادوں سے حل نہیں ہو سکتا۔ وہ تارکینِ وطن جو ان علاقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو اب ہندوستان اور مہاراجہ کے زیر اقتدار ہیں گے۔ ان علاقوں سے نکالے ہوئے مظلومین کی واپسی کیلئے غیر معمولی تحفظات کی ضرورت ہوگی آزاد علاقہ کے تھوڑے بہت لوگ آسانی سے واپس چلے جائیں گے لیکن ہندوستانی علاقے میں قدم رکھنے سے پیشتر وہ ہزار مرتبہ سوچیں گے۔ اور پھر یہ معاملہ محض ان کو متعلقہ علاقوں میں واپس بھیجدینے سے ہی ختم نہیں ہو جائے گا۔ ان کی بحالی اور آبادکاری کی ضرورت واپسی سے بھی اشد ہوگی۔ بیشتر پناہ گزین ایسے ہیں جن کے گھر بار لٹ چکے ہیں۔ وہ ویرانوں میں جا کر نہیں رہ سکتے۔ ان کے ابتدائی انسانی حقوق کا تحفظ از بسکہ لازمی ہے۔ ڈوگرہ راج میں انسانیت کی جو تذلیل ہوئی اس کے پیش نظر ریاست میں انسانی حقوق کا ذکر بے محل نظر آتا ہے، لیکن اب جبکہ اقوام متحدہ دخیل ہو رہی ہے تو اسے ایسی فضا پیدا کرنی ہوگی جس میں انسانی حقوق کا احترام و تحفظ ہو سکے۔

ان پناہ گزینوں کی واپسی کے ساتھ ساتھ ان خارجیوں کا مسئلہ سامنے آتا ہے جو جائز ضروریات کے علاوہ کشمیر پر مسلط کر دیئے گئے۔ پاکستانی علاقے میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو مظلوم کشمیریوں کی امداد کو باہر سے پہنچے۔ لیکن ہندوستانی علاقے میں وہ لوگ بھی ہیں جو ووٹ دینے کے لئے ریاست میں "آباد" کر دیئے گئے۔ ان کی تلاش امتحان کا اخراج ایک اور مشکل پیدا کر دے گا۔ تصفیہ کرتے وقت آبادی کے اس داخل و خارج کے تمام پہلوؤں کو نگاہ میں رکھنا چاہئے۔ یہی نہیں بلکہ ہندوستان سے وہ "شرنارتھی" بھی آئیں گے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کشمیر چھوڑ کر ہندوستان چلے گئے!

کمیشن نے اس ضمن میں فیصلہ کیا ہے کہ کوئی ایسا شخص ریاست میں نہ رہے جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد کسی جائز قانونی ضرورت کے علاوہ ریاست میں داخل ہوا۔ پناہ گزینوں کی واپسی کے لئے کمیشن نے

ہندوستانی اور پاکستانی علاقوں کے لئے علیحدہ کمیشن مقرر کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے۔ ان کی ترکیب اور کارگزاری باہمی مشاورت سے طے ہوگی۔

ان تجاویز کا تقابل ان تجاویز سے کیا جائے جو ۱۳ اگست ۱۹۴۸ء کو کمیشن نے پیش کیں تو معلوم ہوگا کہ ۵ جنوری کی تجاویز کو . . . . زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول بنا دیا گیا ہے قرارداد اگست مبہم بھی تھی اور اس اصل سے متعلق خاموش تھی جس کی بنا پر ۲۱ اپریل ۱۹۴۸ء کی قرارداد کی رو سے کشمیر کمیشن معرضِ وجود میں آیا تھا۔ کمیشن کو یہ فریضہ تفویض کیا گیا تھا کہ وہ جنگ بند کرائے اور استصواب کے لئے فضا سازگار کرے۔ کمیشن نے جنگ بند کرانے کا تو ذکر کر دیا لیکن استصواب کو نظر انداز کر دیا۔ کہا جا سکتا ہے کہ اگر دونوں حکومتیں قرارداد اگست کو منظور کر لیتیں تو استصواب کا مسئلہ خود بخود سامنے آجاتا، لیکن یہ عین ممکن تھا کہ ایسا نہ ہوتا، کیونکہ ہندوستان استصواب کے حق میں نہیں تھا اور وہ حیلوں بہانوں سے اسے ٹال رہا تھا۔ اس خدشہ کو مزید تقویت خود ان یادداشتوں نے بہم پہنچائی جو ڈاکٹر لوزانو اور مسٹر نہرو کے مابین ملاقاتوں سے متعلق ہیں اور جنہیں حکومتِ ہندوستان نے قبل از وقت اور بلا رضامندی کمیشن و پاکستان شائع کر دیا۔ ان یادداشتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وزیرِ اعظم ہندوستان نے انتہائی زور لگایا کہ استصواب برپا نہ ہو بلکہ کوئی متبادل صورت اختیار کی جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کمیشن کی استصواب سے متعلق خاموشی اسی دباؤ کا نتیجہ یا اس کے احترام میں ہو۔

مظلومینِ کشمیر جنہیں انگریزوں نے رسوائے عالم معاہدہ امرتسر کی رو سے ڈوگروں کے ہاتھ بیچ دیا تھا ایک سو سال سے ڈوگرہ سنگینوں کے سائے میں دم توڑ رہے تھے۔ انھوں نے اس ذلت کی زندگی سے نکلنے کی کوششیں بھی کیں، لیکن وہ ڈوگرہ کابوس سے رہائی حاصل نہ کر سکے۔ قیامِ پاکستان نے ان کے خاکسترِ حیات کو پھر سے برافروختہ کیا۔ جلنے مرنے والوں کی خاکستر صرف تعمیرِ سحرِ آزادی ہونے لگی۔ ہندوستان، مظلوموں سے ہمدردی کا دم بھرنے والا نہرو، مہاراجہ کشمیر کے خلاف جنگِ آزادی لڑنے والوں کا پشتیبان نہرو، کیل کانٹے سے لیس ہو کر ظالم اور مستبد مہاراجہ کی دعوت پر کشمیر آ پہنچا اور جنت نظیر کشمیر کو جہنم زار بنا کے رکھ دیا۔ اس نے عہد کر لیا کہ دنوں میں سرزمینِ کشمیر سے نخلِ آزادی کا کلی استیصال کر کے غلامی کا بیج ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بو جائیگا۔ لیکن آزادی کا امڈتا سیلاب جو تنہا مہاراجہ سے نہ تھم سکا تھا، وہ مہاراجہ اور نہرو کی ملی بھگت سے بھی نہ تھم سکا۔ موجِ آب بڑھ گئے دریائے تند و تیز ہو گئی اور مہاراجہ اور نہرو دونوں خس و خاشاک کی طرح بہتے نظر آنے لگے۔ دونوں کی آنکھیں بالآخر کھلیں، اور انھیں یقین ہو گیا کہ کشمیری مسلمان رینگتا کیڑا نہیں بلکہ پیل ژندہ ہے۔ ناچار یک سکسیس اور پیرس کے طواف شروع ہو گئے کہ کہیں سے وہ "نسخہ کیمیا" میسر آئے کہ ان کی درندہ فوجیں مسِ خام سے کندن بن جائیں۔ بظاہر حق کی فتح نظر آرہی ہے اور باطل خائب و خاسر نظر آرہا ہے۔

لیکن ہمیں خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیئے۔ فلسطین کا مسئلہ مجلس تحفظ کے ہاتھوں ڈوبا۔ حیدر آباد کا مسئلہ اسی مجلس کے روبرو پیش ہے اور اس کے ایجنڈے سے خارج نہیں ہوا۔ انڈونیشیا میں دیکھتے دیکھتے ہالینڈ نے اندھیر مچا دیا اور حریت و آزادی کی شمعیں ایک ایک کرکے گل کر دیں اور مجلس تحفظ اسی شب تار کو صبح روشن سمجھ رہی ہے۔ خود اپنے ہاں ریڈکلف کی مہلک مثال موجود ہے۔ ایک "غیر جانبدار" اور "معتمد علیہ" کو قوموں کی قسمت سونپی گئی اور وہ شقی القلب لاکھوں کے محضر قتل پر دستخط کرکے یہاں سے رخصت ہوگیا۔ ریڈکلف کے معاملے میں پاکستان نے خطرناک ترین غلطی کا ارتکاب کیا۔ اگر ریڈکلف کو یوں کھلی چھٹی نہ دے دی جاتی اور اس . . . . . . کی مزعومہ دیانت سے متعلق ہم نے علی وجہ البصیرت فیصلہ کیا ہوتا تو آج کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ صرف ایک گورداسپور کا ضلع جس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور جو حق و انصاف اور آئین و قانون کے جملہ اصولوں کے مطابق مسلمانوں کے ہی حصہ میں آنا چاہیئے تھا، مسلمانوں کے حصہ میں آجاتا تو کشمیر کے ہندوستانی دروازے کلیتہً مسدود ہو جاتے اور ہندوستانی اور ڈوگرہ درندے خوفناک ہلاکت نہ پھیلا سکتے۔ اب پھر ہم ایسے ہی مقام پر ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ذرا سی غفلت ہماری ہلاکت کا باعث ہو جائے۔ ریڈکلف کے بھرپور وار سے تو ہم ایک حد تک جانبر ہوگئے ہیں لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ایک اور ریڈکلف ہمارے نصیب میں لکھا گیا تو پاکستان ختم ہو چکا ہوگا۔

ہندوستان کی نیت صاف نہیں۔ اس کے عزائم غیر مشتبہ ہیں۔ وہ کشمیر کو حتی الوسع ہاتھ سے جانے نہیں دیگا۔ حق وانصاف اور آئین وجمہور کی رو سے کشمیر پاکستان اور صرف پاکستان میں جا سکتا ہے۔ لیکن دہلی حق وانصاف کا گہوارہ نہیں، نہ آئین وجمہوریت کا موزوں مسکن۔ ہندوستان دھوکہ اور سیاسی قزاقی سے کشمیر کو ہتھیائیگا۔ نہرو، پٹیل، آئنگر، عبداللہ بارہا اعلان کر چکے ہیں کہ کشمیر ہندوستان کا حصہ ہے اور ہندوستان ہی سے الحاق کرے گا۔ وہ استصواب کو غیر ضروری اور ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں۔ وہ اس کا نتیجہ جانتے ہیں۔ انہیں اپنے انجام کا پختہ یقین ہے۔ لہٰذا وہ خلوص اور دیانت سے پہلو تہی کریں گے۔ خلوص اور دیانت کا نتیجہ ان کے خلاف جائے گا۔

التوائے جنگ کے فیصلہ سے پیشتر ہندوستان نے اس عہد کے باوجود کہ وہ کشمیر میں جنگ تیز تر نہیں کریگا اور حالات کو اور بگڑنے سے روکیگا، اس نے بھاری حملے کئے اور بڑے علاقے اپنے قبضہ میں کر لئے۔ برفباری اس کی پسپائی کا پیغام لا رہی تھی۔ اس کا اندرونی خلفشار اور بدنظمی اور ہمہ گیر عدم اطمینان اس پر مستزاد تھے۔ اس نے سستانے کا موقع ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اس کے نئے ہتھیائے ہوئے علاقے سردیوں میں اس کے پاس رہیں گے۔ بہار اور گرما میں؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان اپنے قدم اور مستحکم کر لے اور کسی بہانہ سے فیصلۂ التوائے جنگ کو بدل دے؟ ایک غیر شریف حریف سے یہ بعید نہیں۔ کشمیر اس کے لئے وقار کا سوال بن گیا ہے، انصاف آئین کا سوال نہیں رہا۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۵۰ پر ملاحظہ فرمائیے)

تلمیحاتِ اقبال

(قرآن کریم سے)

[یہ تقریر جناب پرویز نے ۸ جنوری کو ریڈیو پاکستان کراچی سے نشر فرمائی۔ ہم ارباب ریڈیو سے باقاعدہ اجازت لیکر اس کی اشاعت کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔ طلوع اسلام]

کسی مفکر کے پیغام کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے فکر کے سرچشمہ کے متعلق صحیح معلومات بہم پہنچائی جائیں۔ اس لئے کہ جب تک اس اصل کی حقیقت معلوم نہ ہو جائے جس سے اس کے فکر کی شاخیں پھوٹی ہیں، اس کے برگ و بار کی ماہیت اور اہمیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں ہو سکتا۔ اکثر مفکرین اپنی اساسِ فکر کو اس طرح غیر معین اور مبہم چھوڑ جاتے ہیں کہ ان کے پیغام پر غور و فکر کرنے والوں کو اس اصل و اساس کے تعین میں بڑی دشواری پیش آتی ہے اور ان کے ناقدین و شارحین کی قیاسی سراغ رسانیوں سے یہ معمہ پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ کچھ عرصہ کے بعد ان کے پیغام پر ان قیاس آرائیوں کے اتنے دبیز پردے پڑ جاتے ہیں کہ حقیقت نگاہوں سے یکسر گم ہو جاتی ہے اور لوگ جسے ان مفکرین کا پیغام سمجھتے ہیں، وہ ان کے ناقدین اور شارحین کی خیال آفرینیوں سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ اس باب میں علامہ اقبال کی ہستی منفرد نظر آتی ہے، کہ انہوں نے اپنے فکر کے سرچشمہ اور اپنے پیغام کی اساس کو اس طرح واضح اور غیر مبہم طور پر بیان کر دیا ہے، کہ اس میں کسی ظن و تخمین اور قیاس و گمان کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ بایں ہمہ اسے ہماری لذتِ نکات آفرینی کہئے یا ذوقِ تجسس، کہ پیامِ اقبال سے دلچسپی رکھنے والے گذشتہ دس برس سے اسی تحقیق و جستجو میں سرگرداں و حیران پھر رہے ہیں کہ علامہ اقبال کے فکر کے ماخذ کیا تھے اور انہوں نے کن کن افکار و خیالات سے متاثر ہو کر اپنا پیغام متعین کیا تھا۔ انہی قیاس آرائیوں کا نتیجہ ہے کہ کوئی ان کے فکر کو کانٹ کے فلسفہ کا رہینِ منت بتاتا ہے اور کوئی نیٹشے کے خیالات کا پرتو۔ کہیں انہیں برگسان کا آئینہ دار کہا جاتا ہے اور کہیں ہیگل کا خوشہ چیں۔ اور یہ نہیں سوچتے کہ جب انہوں نے خود واضح طور پر بتا دیا ہے کہ ان کی فکر کا ماخذ کیا ہے اور وہ کن حقائق سے متاثر ہوتے ہیں، تو پھر اس کاوشِ بے جا اور کاہشِ لاحاصل سے مقصود کیا ہے! اس میں کوئی کلام نہیں کہ علامہ مرحوم نے مشرقی و مغربی علوم قدیمہ و جدیدہ کا بدقتِ نظر مطالعہ کیا تھا اور چونکہ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا اس لئے انہوں نے

مغربی مفکرین کے افکار و تصورات پر گہری نظر ڈالی تھی۔ لیکن اس سے یہ مفہوم نہیں کہ ان کے فکر کی اساس، ان مفکرین کے تصورات و نظریات پر تھی۔ ان کی فکر کی اساس ایک محکم اور مستقل حقیقت پر تھی۔ جو نہ مشرق سے متاثر ہوتی ہے نہ مغرب سے۔ وہ اس کی تائید و تشریح میں مشرق و مغرب کے خیالات و تصورات کو استشہاداً پیش کرتے تھے لیکن وہ اسے ان کے قیاسات و مزعومات سے ملوث نہیں ہونے دیتے تھے۔ بلکہ وہ تو یہاں تک کہتے تھے کہ جس مقام سے وہ بات کر رہے ہیں وہ حکمت و فلسفہ کی حد سے ماوراء ہے۔

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

عصرِ حاضر کے علوم و فنون کے متعلق انھوں نے واضح طور پر کہہ دیا کہ ان میں جو باتیں انھوں نے اس حقیقت کے مطابق پائی ہیں جس پر ان کے فکر کی اساس تھی، انھیں تائیداً لے لیا گیا ہے اور جو چیزیں خلافِ حقیقت ہیں ان کے فریب کو بے نقاب کر دیا گیا ہے۔

طلسمِ علمِ حاضر را شکستم ربودم دانہ و دامش گسستم
خدا داند کہ مانندِ براہیم بنارِ او چہ بے پروا نشستم

غور کیجئے۔ جو شخص دورِ حاضر کی علم و حکمت کو آتشِ نمرود قرار دے رہا ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہ اس نے اپنی فکر کی اساس اس علم و حکمت پر رکھی تھی، اس پر کتنا بڑا بہتان ہے۔ علومِ جدیدہ ہی نہیں، بلکہ علومِ قدیمہ کے نظریات کے متعلق بھی ان کا یہی مسلک تھا۔ ان غلط نظریاتِ زندگی اور تصوراتِ حیات کو وہ "ملا و صوفی" کی جامع اصطلاحات سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند کہ ملا کم شناسد رمزِ دیں را

جدید و قدیم دونوں کے متعلق۔

بفلسفی سے نہ ملا سے ہے غرض مجھ کو یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب علامہ اقبال نے اپنی فکر کو کہیں سے مانگے ہوئے افکار و نظریات سے متاثر نہیں ہونے دیا تو وہ کونسی حقیقتِ ثابتہ تھی جس پر اس فکر کی اساس تھی۔ جیسا کہ میں نے شروع میں کہا ہے، انھوں نے اسے ایسے واضح الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ اس کے متعلق کسی قسم کی تاویل و تعبیر کی گنجائش ہی نہیں رہنے دی۔ ان کا پیغام سب سے پہلے منضبط صورت میں، اسرار و رموز میں ہمارے سامنے آتا ہے جو ان کی سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس مثنوی کے آخر میں انھوں نے اس ذاتِ اقدس و اعظم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی بارگاہ میں ایک عرضداشت پیش کی ہے، جو ان کے عشق کی منتہیٰ، ان کے آرزوؤں کی محور اور ان کی تمناؤں کی مرکز تھی۔ اس دعا میں وہ کہتے ہیں کہ

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

یعنی اگر میرے پیغام میں قرآن کے سوا کچھ بھی اور ہے تو اے ختم رسل، دانائے سبل۔

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن　　　این خیابان راز خارم پاک کن

نہ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ

روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا　　　بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

جن کی نگاہیں قلب اقبال پر ہیں وہ اس شدتِ احساس کا خوب اندازہ لگا سکتے ہیں جس کے ماتحت انھوں نے اپنے حق میں اتنی بڑی تعزیر روا رکھی ہے۔ اس سے آگے چل کر وہ کہتے ہیں کہ

گردُرِ اسرار قرآں سفتہ ام　　　با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

اور اگر میرا پیغام، قرآن ہی کا ترجمان ہے تو

عرض کن پیشِ خدائے عزوجل　　　عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل

میں نہیں سمجھتا کہ ایسے کھلے کھلے الفاظ کے بعد اس کی گنجائش بھی باقی رہ جاتی ہے کہ اس کی تحقیق کی جائے کہ اقبال کے فکر کا سرچشمہ کیا تھا اور ان کی نگاہیں کس آفتاب حقیقت سے مستنیر تھیں۔ میرے نزدیک اقبال کی عظمت و عقیدہ اسی بنا پر ہے کہ انھوں نے جو کچھ سمجھا قرآن سے سمجھا اور جو کچھ سمجھایا قرآن سے سمجھایا۔ ان کی مئے سخن، براست خمکدۂ حجاز سے سرمہر آبگینوں میں آیا کرتی تھی اور اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوتی تھی۔ ان کا مسلک یہ تھا کہ

نہ تاک بادہ گیرم و نہ در ساغر افگنم

اقبال کے پیغام کو سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ اس میں جہاں جہاں قرآن کا ذکر آتا ہے وہ کس جذب و شوق اور کیف و مستی سے جھومتے نظر آتے ہیں۔ اقبال کے نزدیک قرآن کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں:

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست　　　زیرِ گردوں سرِ تمکینِ تو چیست

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم　　　حکمتِ او لایزال است و قدیم

نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات　　　بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

حرف او را ریب نے تبدیل نے　　　آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوعِ انساں را پیامِ آخریں　　　حامل او رحمۃ للعالمیں

اور سنئے۔

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است　　　ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست　　　عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

بندۂ مومن ز آیاتِ خدا است　　　ہر جہاں اندر بر او چوں قبا است

چوں کہن گردد جہانے در برش　　　می دہد قرآں جہانے دیگرش

یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو ان کے فہم قرآن کے کسی مقام سے اختلاف ہو لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے فکر کی

اساس کچھ اور تھی۔ اب آپ یہ سوچئے کہ جس مفکر کے فکر کا سرچشمہ قرآن ہو۔ نہیں! بلکہ جس کا دعوٰے یہ ہو کہ میرے پیغام میں غیرِ قرآن ایک حرف بھی نہیں۔ اس کے پیغام سے قرآن کی تلمیحات پیش کرنا۔ اس کے پورے کے پورے پیغام کو پیش کرنا ہوگا۔ تلمیح قرآنی کے معنی یہ ہیں کہ اگر علامہ اقبالؔ اپنے کسی شعر میں قرآن کی کسی آیت کا کوئی لفظ یا ٹکڑہ لائے ہیں تو یہ بتا دیا جائے کہ اس سے کس آیتِ قرآنی کی طرف اشارہ ہے۔ مثلاً انھوں نے اپنی نظم، خضرِ راہ کے ایک مصرعہ میں لکھا ہے۔

آ بتاؤں تجھ کو رمزِ آیۂ ان الملوک

تو ان الملوک کی تلمیح سے اشارہ ہے سورۂ نمل کی اس آیۂ مقدسہ کی طرف کہ قَالَتْ اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا وَجَعَلُوْٓا اَعِزَّةَ اَهْلِهَآ اَذِلَّةً ۚ وَكَذٰلِكَ يَفْعَلُوْنَ۔ ملکۂ سبا نے کہا کہ بادشاہ جب کسی بستی (کو فتح کر کے اس) میں داخل ہوتے ہیں تو اس کا تختہ الٹ دیتے ہیں۔ اور وہاں کے صاحب عزت وحشمت لوگوں کو ذلیل وخوار کر دیتے ہیں۔ اور یہ کوئی ہنگامی چیز نہیں۔ بلکہ ملوکیت کا خاصہ ہے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے، چونکہ اقبالؔ کے پیغام کا ماخذ ہی قرآن ہے، اس لئے ان کی جس کتاب کو اٹھایئے آپ دیکھیں گے کہ قرآنی آیات کی طرف اشارہ برابر چلا آرہا ہے۔ کہیں خود قرآن کے الفاظ میں اور کہیں قرآنی مفہوم اپنے الفاظ میں۔ مثلاً اسرار و رموز کے چند اشعار لیجئے۔

آنکہ بر اعدا درِ رحمت کشاد　　مکہ را پیغامِ لاتثریب داد

نبی اکرمؐ نے جب مکہ فتح کیا ہے تو سردارانِ قریش، جنھوں نے حضورؐ کی ایذا رسانی اور تکلیف دہی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، پا بجولاں سامنے کھڑے تھے۔ دنیا کے ہر قانون کی رو سے ان کی سزا قتل تھی۔ لیکن حضورؐ نے اپنے انتہائی عفو کریمانہ سے کام لیا اور فرمایا کہ لا تثریب علیکم الیوم۔ جاؤ۔ آج تم سے کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ قرآن کریم میں یہ الفاظ حضرت یوسفؑ کی زبان سے آئے ہیں۔ جب انھوں نے اپنے بھائیوں کی ہر خطا کو معاف کر دیا تھا۔ ایک اور شعر ہے۔

ایکہ در زندانِ غم باشی اسیر　　از نبی تعلیم لا تحزن بگیر

شبِ ہجرت کی صبح، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابا بکر صدیقؓ کی معیت میں ایک غار میں چھپے بیٹھے تھے کہ دشمنوں کے پاؤں کی آہٹ کان میں آئی۔ حضورؐ کی حفاظت کے خیال سے حضرت صدیق اکبرؓ کی پیشانی پر تردد کے آثار نمایاں ہوگئے۔ حضورؐ نے اسے بھانپا اور دل کے کامل سکون اور اطمینان سے فرمایا کہ لا تحزن ان اللہ معنا۔ مت گھبراؤ۔ ہم اکیلے نہیں ہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہی ہے وہ واقعہ جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ — از نبی تعلیم لا تحزن بگیر۔

یا مثلاً جب صاحب ضربِ کلیم حضرت موسیٰؑ کا ساحرینِ دربارِ فرعون سے آمنا سامنا ہوا ہے اور جادوگروں کی رسیاں دیکھنے والوں کی نگاہوں میں سانپ بن کر دوڑنے لگی ہیں تو حضرت موسیٰؑ کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں لوگ

ان کی نگاہ فریبی سے متاثر ہو کر باطل کی طرف نہ جھک جائیں۔ اس پر اللہ کی طرف سے ارشاد ہوا کہ لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ۔ اے موسیٰ مت گھبراؤ۔ یقیناً تم ہی غالب رہوگے۔ اقبال، مردِ مومن کے متعلق فرماتے ہیں کہ

چو کلیمے سوئے فرعونے رود　　قلبِ او از لاتخف محکم شود

ان اشعار میں تو آیاتِ قرآنی کے ایک ایک دو دو الفاظ ہی آئے ہیں۔ بعض اوقات پورے کا پورا مصرعہ آیتِ قرآنی پر مشتمل ہوتا ہے۔ مثلاً وطنیت کے پرستاروں کے متعلق کہتے ہیں۔

بہتے جُستند در بِئْسَ الْقَرَار　　تا اَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَار

سورہ ابراہیم میں ہے۔ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ بَدَّلُوا نِعْمَتَ اللَّهِ كُفْرًا وَأَحَلُّوا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصْلَوْنَهَا وَبِئْسَ الْقَرَارُ۔ کیا تونے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنھوں نے خدا کی نعمتوں کی ناسپاس گذاری کی، اور اس طرح اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر میں لے گئے۔ یعنی جہنم میں داخل ہوگئے۔ اور وہ کیسی بری جگہ ہے ٹھہرنے کی۔

ان اشعار میں قرآنی الفاظ سے آیاتِ قرآنی کی طرف اشارے کئے گئے ہیں۔ لیکن ایسے اشعار بھی ہیں جن میں اپنے الفاظ میں قرآنی آیات کی طرف تلمیحات ہیں، مثلاً حضرت ابراہیمؑ کے متعلق فرماتے ہیں۔

بہرِ او ویرانہ آباد کرد　　طائفاں را خانہ بنیاد کرد

پہلے مصرعہ میں ویرانہ سے اشارہ ہے سورۂ ابراہیم کی اس آیت جلیلہ کی طرف جس میں حضرت ابراہیمؑ نے بحضور رب العزت عرض کیا تھا کہ رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ۔ ہمارے پروردگار میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو اس وادی میں آباد کر دیا ہے جس میں شگفتگی و شادابی کا نام ونشان تک نہیں۔ اور دوسرے مصرعہ (یعنی، طائفاں را خانہ بنیاد کرد) میں اشارہ ہے سورۂ بقرہ کی اس آیت کی طرف جس میں ارشاد ہے کہ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۔ اور ہم نے ابراہیم و اسمٰعیل کو حکم دیا کہ وہ طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے ہمارے گھر کو پاک کر دیں۔

میں نے ان اشعار کو محض تمثیلاً پیش کیا ہے ورنہ مفہوم کے اعتبار سے اقبال کے پورے کے پورے پیغام سے بتایا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن کے کس مقام کا ترجمان ہے۔ وہ اپنے الفاظ کے پردے میں سب کچھ کہہ گئے ہیں۔ پیامِ مشرق میں ہے۔

پردہ برگیرم و در پردہ سخن می گویم　　تیغ خوں ریزم و خود را بہ نیامے دارم

لہٰذا اگر یہ صحیح ہے کہ کسی مفکر کے پیغام کی حقیقت سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک اس کے پیغام کے ماخذ اور اس کے فکر کی اساس کو نہ سمجھا جائے تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ اقبال کے پیغام کو نہیں سمجھا جا سکتا جب تک پڑھنے والے کے سامنے قرآن نہ ہو۔ جو اقبال کو اس طرح نہیں سمجھتا وہ اس کے الفاظ میں کھو کر رہ جاتا ہے، حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا۔ انہی کے متعلق اقبال نے کہا تھا کہ۔

آشنائے من ز من بیگانہ رفت　　از خمستانم تہی پیمانہ رفت
من شکوہِ خسروی او را دہم　　تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم
او حدیثِ دلبری خواہد ز من　　رنگ و آبِ شاعری خواہد ز من
کم نظر بیتابیٔ جانم نہ دید　　آشکارم دید و پنہانم نہ دید

حکومت اور مملکت

دسمبر ۱۹۴۸ء میں، کراچی میں، پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں حسب ذیل قرارداد منظور کی گئی

> تمام رکن اخبارات کو ہدایت دی جائیں کہ وہ نہ تو ایسے خیالات کا اظہار کریں اور نہ ایسے اظہار کو اپنے ہاں اجازت ہی دیں جو سٹیٹ کے استحکام کے منافی ہوں، عام اس کے کہ وہ خیالات مذہب ہی سے منسوب کیوں نہ کئے جائیں۔

اس قرارداد پر جس انداز سے بحث و تمحیص ہوئی وہ اس حقیقت کا غماز تھا کہ بہت سے قلوب و اذہان میں حکومت (Government) اور مملکت (State) کا فرق واضح نہیں۔ جس کی وجہ سے وہ عجیب قسم کے ذہنی اختلال و انتشار میں مبتلا ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ ابھی تک فلسفۂ سیاست (Political Philosophy) عام نہیں ہوا، اس لئے یہاں اس قسم کے مسائل و مباحث پر بہت کم لکھا گیا ہے کہ مملکت کسے کہتے ہیں۔ فرد اور مملکت کا باہمی تعلق کیا ہے۔ حکومت اور مملکت میں کیا فرق ہے۔ آئین کی پابندی اور محکومی میں کیا فرق ہے، حکومت کا قانون کس حد تک افراد کی شخصی آزادی میں مداخلت کر سکتا ہے۔ کیا قانون کا احترام محض مملکتی مصالح پر مبنی ہے یا اس کی کوئی مستقل قدر ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام مسائل طلوعِ اسلام کے پیش نظر ہیں لیکن ہنگامی حوادث اس قدر سامنے آ رہے ہیں کہ وہ ان مسائل کی طرف توجہ کی فرصت ہی نہیں دیتے۔ ذرا ان حوادث سے فرصت مل جائے تو انشاء اللہ ان مباحث پر بھی گفتگو ہو جائے گی۔ اس وقت ہم صرف اس الجھاؤ کو سامنے لانا چاہتے ہیں جو حکومت اور مملکت کا فرق ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہو رہا ہے اور جو، ہمارے نزدیک، بہت سی بنیادی خرابیوں کا موجب بن سکتا ہے۔

مملکت (State) ایک مجرد اصطلاح ہے جس کا مفہوم چند الفاظ میں ادا نہیں کیا جا سکتا۔ اسے سمجھنے کے لئے اس کے عناصر ترکیبی کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ایک منطقۂ زمین میں بسنے والے افراد (جسے ملت کہئے) اپنے لئے ایک نظامِ زندگی متعین کرتے ہیں اور اس نظام کو نافذ العمل کرنے کے لئے اسے آئینی شکل دیتے ہیں جس سے زندہ نتائج ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اس سرزمین، ملت، نظام، اور آئین کے تصوراتی مجموعہ کو مملکت کہتے ہیں۔ حکومت نام ہوتا ہے اس مشینری کا جو اس آئینی نظام کو نافذ کرتی ہے۔ انسانی ہیئت اجتماعیہ کے

ابتدائی ادوار میں حکومت اور مملکت میں بالعموم کچھ فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ مملکت نام ہوتا تھا سلطنت کا اور حکومت عبارت ہوتی تھی سلطان کی ذات سے۔ چنانچہ سلطنتیں، سلاطین کی شخصیتوں سے قائم یا ختم ہوتی تھیں۔ ایک بادشاہ مرگیا، مارا گیا یا گرفتار ہوگیا، تو اس کی سلطنت بھی ختم ہوگئی۔ یا اس سے آگے بڑھی تو سلطنت ایک خاندان میں محدود ہو کر رہ گئی۔ یعنی اس وقت کی دنیا کا نظامِ اجتماعی، اشخاص سے وابستہ ہوتا تھا۔ اس کا اثر یہاں تک غالب تھا کہ میدانِ جنگ میں ایک سپہ سالار کے گرفتار ہو جانے سے یا مارے جانے سے ساری کی ساری فوج، مفتوح و مغلوب ہو جاتی تھی۔ یہی پوزیشن دار السلطنت کو حاصل تھی۔ اگر کسی سلطنت کا دار الخلافہ فتح ہوگیا تو ساری سلطنت قبضہ میں آگئی۔ چونکہ سلطنتیں، سلاطین کی ذات سے وابستہ ہوتی تھیں اس لئے سلاطین، تمام قوتوں کو اپنی ذات میں محصور رکھتے تھے۔ سلطان کے خلاف لب کشائی، سلطنت سے غداری یا بغاوت پر محمول ہو جاتی تھی۔ اسی سلطانی اقتدار کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ان کے ربانی حقوق (Divine Rights) کا ابلہ فریب عقیدہ وضع کیا گیا جس سے بادشاہ ظل اللہ (خدا کا سایہ) اور ایشور کا اوتار قرار پا گیا۔ اب اس کی ذات ہر قسم کی تنقید کی حد سے بالا ہوگئی۔ اس کا تقدس جزوِ ایمان بن گیا۔ یہ تھے وہ سہارے جن کے بل بوتے پر ازمنہ مظلمہ میں، انسان اپنے اقتدارِ آمریت کو قائم رکھا کرتا تھا۔

قرآن نے دنیا کو سلطنت کی جگہ خلافت کا تصور دیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ تاریخ میں اس سے پہلے کہیں کہیں تصورِ جمہوریت کے دھندلے سے نقوش دکھائی دیتے ہیں، لیکن خلافت کے انقلابی تصور کو اپنی منضبط شکل میں سب سے پہلے قرآن ہی نے پیش کیا ہے۔ ہمیں اس وقت سلطنت اور خلافت کے تمام پہلوؤں کا تقابل مقصود نہیں۔ (یہ ایک جداگانہ مبحث ہے اور فرصت کی متقاضی) اس وقت ہم صرف اس کے اسی حصہ کی طرف اشارہ کریں گے جس کا تعلق مملکت اور حکومت کے فرق سے ہے۔ قرآن کی رُو سے اصل شے جماعت یا ملت ہے۔ ملت، مسائلِ اجتماعیہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے اپنا مرکزی ادارہ قائم کرتی ہے جسے حکومت کہتے ہیں۔ حکومت بدلتی رہتی ہے۔ یعنی افرادِ حکومت ایک کے بعد دوسرے آتے رہتے ہیں (کہ خلافت کے معنی ہی ایک کے بعد دوسرے کے ہیں) اسے باقی ملت، ...لئے ہوتی ہے۔ افرادِ حکومت تابع ہیں، ... افراد و امین ہونے کی جہت سے ملت کے ماتحت ہوتے ہیں۔ (اور ملت، آئینِ الٰہیہ کی پابند ہونے کی جہت سے، خدا کے سامنے جوابدہ) بنا بریں ملت کو افرادِ حکومت پر تنقید کا پورا پورا حق ہوتا ہے، اس لئے کہ وہ افرادِ ملت ہی کے نامزد ہوتے ہیں اور ملت کو اختیار ہوتا ہے کہ جس وقت مناسب سمجھے اپنی نمائندگی کسی اور کو تفویض کردے۔

مسلمانوں نے کس طرح تصورِ خلافت کو پھر سے سلطان (ملوکیت) کی لعنت میں بدل دیا، یہ ایک حدیثِ دلخراش اور داستانِ الم انگیز ہے۔ اسے اس وقت چھوڑیئے۔ سردست یہ دیکھئے کہ خلافت کا جو تصور قرآن نے دیا تھا اور جسے نبی اکرمؐ اور حضورؐ کی جماعت نے دنیا میں متشکل کرکے دکھایا، وہ چونکہ قرآن سے باہر کہیں اور نہ تھا اس لئے باقی دنیا اس تصور سے محروم تھی اس لئے وہ عقلی طور پر مملکت اور حکومت کی گتھیاں

سلجھانے میں مصروف رہی۔ تاآنکہ انسان نے ملوکیت کے تلخ تجارب سے تنگ آکر نظامِ حکومت کی کوئی بہتر شکل اختیار کرنی چاہی اور یہ شکل مغربی جمہوریت کے پیکر میں دنیا کے سامنے آئی (اس جمہوریت اور قرآنی خلافت میں کیا فرق ہے یہ بحث بھی جداگانہ ہے اور فرصت کی محتاج)۔ ہر چند، یہ شکل انسان کے اس تقاضا کو پورا نہیں کر سکتی تھی جو ملوکیت کے ردِ عمل کے طور پر اس کے سینہ میں ابھرا، لیکن اس سے اس کی تسکین ضرور ہو گئی کہ اس نے فرمانیتِ سلطانی سے انتقام لے لیا ہے۔ اس تبدیلی سے انفرادی اقتدار سے، جماعتی تصور کی طرف ایک قدم ضرور اٹھا۔ لیکن افراد کے منہ کو قوت کا جو ہو لگ چکا تھا اس کا مزہ چھوٹتے چھوٹتے ہی چھوٹ سکتا تھا۔ اختیارِ مطلق کا یہ "مزہ" ڈکٹیرشپ[1] (آمریت) کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اس نے آکر پھر اسی آئین کہن کو تازہ کر دیا جس کی رو سے مملکت اور حکومت میں کچھ فرق نہیں ہوتا تھا اور مملکت کا وجود، ایک فرد کی ذات سے وابستہ ہوتا تھا۔ اب مملکت پھر عبارت ہو گئی فرد یا افراد کی، یک جماعت سے اور افرادِ مملکت کا فریضۂ زندگی اس "مملکت" (یعنی ایک فرد یا مخصوص جماعت) کا قیام و بقا قرار پا گیا۔ اب پھر حکومت اور مملکت کا فرق مٹ گیا اور افرادِ حکومت پر تنقید، مملکت پر تنقید کے مرادف ہو گئی، کہ مملکت نام ہی ان افرادِ حکومت کا قرار پا گئی۔ اب پھر اس عقیدہ کی تجدید کی گئی کہ "سٹیٹ مقدس شے ہے اور اس کی تقدیس کا تقاضا ہے کہ کوئی اس پر تنقید نہ کرے"۔ "ربانی حقوق" کے اس بالواسطہ اعادہ سے، پھر افرادِ حکومت تنقید کی حد سے بالا ہو گئے۔

انسانیت کی تاریخ (سوائے اس تھوڑے سے عرصہ کے جب قرآنی تصورِ مملکت و حکومت اپنی عملی شکل میں مشہود ہوا ہے) اسی گردشِ دولابی میں مبتلا چلی آرہی ہے۔

ان مبادیات کو سامنے رکھ کر اب پاکستان کی طرف آئیے۔ مملکتِ پاکستان عبارت ہے ملتِ پاکستانیہ سے، جس نے ایک خاص نظامِ زندگی کو اس خطۂ زمین میں نافذ العمل کرنے کے لئے اپنا جداگانہ تشخص دنیا سے منوایا ہے۔ اس نظام کو ایک زندہ حقیقت بنانے کے لئے اس نے اپنے میں سے کچھ افراد کو نامزد کیا ہے، جن کے مجموعہ کا نام ہے حکومتِ پاکستان۔ لہٰذا زندہ و پائندہ شے ملت ہے، حکومت نہیں۔ حکومت اوزار بدلنے والی مشینری ہے۔ افرادِ حکومت ملت کے نمائندے ہونے کی جہت سے ملت کے سامنے جوابدہ ہیں اس لئے ملت کو ان پر تنقید کا پورا پورا حق حاصل ہے تنقید ہی کا نہیں بلکہ عند الضرورت بدل دینے کا بھی[2]۔ خلافت تو خیر بہت بلند تصور ہے۔ مغربی جمہوریت میں بھی کیفیت ہے کہ انھوں نے ضروری سمجھا تو چیمبرلین کو الگ کر کے چرچل کو لے آئے اور جب اس کی ضرورت ختم ہو گئی تو اسے

---

[1] اس تقابل سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم مغرب کے نظامِ جمہوریت کو زیادہ قابلِ قبول سمجھتے ہیں۔ قرآنی تصورِ حکومت و مملکت کی رُو سے وہ بھی ایسا ہی مردود و مطرود ہے جیسا آئینِ آمریت۔ اس وقت بحث صرف ان ہر دو اسالیبِ حکومت سے ہے۔

[2] یہاں اس بحث کو چھیڑنے کا موقع نہیں کہ قرآنی خلافت میں تنقید کیسے اور کس مقام پر ہو سکتی ہے اور تنقید اور اطاعت کیسے ساتھ ساتھ چل سکتی ہیں اور افرادِ حکومت کو الگ کن حالات میں کیا جا سکتا ہے۔

دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینکدیا۔ افرادِ حکومت بدلتے رہے اور مملکت بدستور قائم رہی۔ لہٰذا افرادِ حکومت پاکستان پر تنقید، مملکتِ پاکستان پر تنقید نہیں کہلا سکتی۔ جو لوگ **مملکت** کو تنقید کی حد سے بالا قرار دیکر **حکومت** کو تنقید سے بالا رکھنے کی تلقین کرتے ہیں وہ مملکت، حکومت کے بنیادی فرق کو نگاہوں سے اوجھل کر کے ایک بہت بڑی غلط روی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ **مملکتِ** پاکستان پر "تنقید" کا ایک ہی مفہوم ہے اور وہ یہ کہ کوئی ایسی حرکت کی جائے جس سے اس مملکت کے استحکام کو ضعف پہنچے۔ یہ تنقید نہیں، مملکتِ پاکستان سے خالص غداری ہے جس کی سزا تختۂ دار ہے۔ لیکن حکومت پر تنقید مملکت سے غداری نہیں قرار پا سکتی۔ حکومت کی تضعیف مملکت کی تضعیف نہیں۔ حتیٰ کہ حکومت کا بدل دینا، مملکت پاکستان کا کسی دوسری مملکت میں بدل دینا نہیں۔ لہٰذا ان دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہئے۔ حکومت پر تعمیری تنقید بڑے صالح نتائج کا موجب ہوتی ہے۔ اس قسم کی تنقید[1] درحقیقت مشورہ کی ایک شکل ہے اور بہترین حکومت، مشاورت پر قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا تنقیدِ صالح کو معیوب قرار دینے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ دنیا میں وہی قومیں زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہیں جو اپنے اعمال کا محاسبہ کرتی رہتی ہیں۔ اور محاسبہ کی بہترین شکل تنقید ہے۔ جو حکومت تنقید کو برداشت نہیں کر سکتی اور اس کے لئے مملکت کو اپنی سپر بنانا چاہتی ہے۔ یعنی جماعت کو یہ کہہ کر تنقید سے روکنا چاہتی ہے کہ یہ تنقید مملکت کے خلاف ہے اور اس کی کمزوری کا باعث، وہ مملکت کی بہی خواہ نہیں۔ وہ سخت خود غرض ہے اور قطعاً اس قابل نہیں کہ زمامِ ملت اس کے ہاتھ میں رہے۔ بڑھنے والی قوموں میں ہمیشہ وہ لوگ ممتاز قرار پاتے ہیں جو مملکت کے بہی خواہ اور حکومت کے نکتہ چیں ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس ڈوبنے والی قوموں میں افرادِ حکومت ان لوگوں کو اپنے قریب رکھتے ہیں جو مملکت کے غدار ہوتے ہیں لیکن حکومت کے ستائش گر۔ ہماری بدبختی سے پاکستان میں اسوقت یہی ہو رہا ہے۔ وہ لوگ جو تمام عمر پاکستان کے نظریہ اور عقیدہ کے سخت ترین مخالف رہے ہیں (اور لہٰذا مملکتِ پاکستان کے دشمن) وہ آج اربابِ حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے سے، مسانید اثر و اقتدار پر فائز ہیں اور وہ افرادِ ملت جنھوں نے اس عقیدہ کی پرورش اپنے خونِ جگر سے کی ہے اس جرم کی پاداش میں معتوب ہیں کہ وہ اربابِ حکومت کو ان کے فرائضِ صحیحہ کی یاد کیوں دلاتے ہیں۔

ہم پاکستان کے اخبارات کے مدیر حضرات سے گذارش کریں گے کہ وہ مملکتِ پاکستان کے استحکام اور افرادِ حکومت پر تنقید کے اس بنیادی فرق کو عوام اور اربابِ اقتدار کے سامنے لائیں اور تنقید کے اس اہم فریضہ سے کبھی نہ چوکیں کہ

یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

---

[1] حکومت پر تنقید، اور حکومت کے فیصلوں سے سرکشی، یکسر مختلف چیزیں ہیں۔ کیا حکومت کے فیصلہ سے سرکشی اختیار کی جا سکتی ہے۔ اور اگر کی جا سکتی ہے تو کن حالات میں؟ یہ سوالات مستقل موضوعات ہیں جنہیں عند الضرورت سامنے لایا جائے گا۔

باب المراسلات

کوئٹہ سے ایک صاحب رقمطراز ہیں:۔

۱۔ شکر الحمدللہ وبحمدہ کہ طلوعِ اسلام کے دورِ جدید کا ایک سال بخیر و خوبی اور کامیابی سے گذرا۔ اور اب طلوعِ اسلام کی حیاتِ نو کا دوسرا سال شروع ہوا۔ گو مجھے طلوعِ اسلام کی باقاعدہ خریداری کا شرف حاصل نہ ہو سکا لیکن میں اس کا ایک مسلسل خواننده (عرصۂ ایک سال سے) ضرور ہوں۔ اور وہ اس طرح کہ یہاں مقامی ایجنٹوں سے پرچہ ماہ بہ ماہ خریدتا ہوں۔

۲۔ طلوعِ اسلام نے ایک سال کے عرصہ میں ملک و ملت کی جو جو عظیم الشان خدمات، جس دیانت، جس صداقت پسندی، جس محققانہ اور مومنانہ بے باکی، جس اخلاص و بے لوثی اور جس حق پژوہی اور ملت دوستی سے سرانجام دی ہیں وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے لئے مسلمانانِ پاکستان طلوعِ اسلام کے مرہون و ممنون ہیں۔ اور اس لئے طلوعِ اسلام کو نئے سال کے آغاز پر مجھ جیسے ایک ہیچمیرز کو بھی مبارک باد کہنے کی جرأت ہو رہی ہے!

۳۔ نہ صرف یہ، بلکہ جن لوگوں کو تحریک پاکستان کے دور میں طلوعِ اسلام کو پڑھنے کا اتفاق ہوا وہ بخوبی جانتے ہیں کہ اس وقت مسئلہ متحدہ قومیت اور اس قسم کے دیگر بے شمار مذموم و مسموم مباحث میں علامہ اقبالؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودی اور طلوعِ اسلام نے مسلمانوں کی جو رہنمائی کی ہے وہ وقت کی سب سے بڑی اور اہم ترین ضرورت تھی۔ اور یہ کہنا ہرگز ہرگز مبالغہ نہ ہوگا، کہ ان ہی مساعی کا ثمرہ خدائے غفور و رحیم نے ہم کو پاکستان کی صورت میں عطا فرمایا! طلوعِ اسلام اس جہادِ عظیم کے لئے پھر مبارکباد کا مستحق ہے۔ اور ملت اسلامیہ اس کی مشکور!!

۴۔ جس طرح ہر مبنی بر حق و صداقت بات کو طلوعِ اسلام ملک ملت کی فوز و فلاح کی خاطر ہر وقتی اور مقامی اثر سے بالاتر ہو کر قلندرانہ کہہ گذرتا ہے۔ عین اسی طرح طلوعِ اسلام کی بیش بہا خدماتِ جلیلہ کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اگر چند سخنہائے گفتنی میں بھی نہایت ہی مخلصانہ طور پر عرض کر دوں تو امید ہے کہ آپ کی طبیعت مکدر نہ ہوگی۔ اور وہ یہ کہ:۔

طلوعِ اسلام کے مطالعہ سے میں باکراہ تمام اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ طلوعِ اسلام اگرچہ مسلمانوں

کی اصلاح کرکے ان میں حیاتِ اجتماعیہ کے شعور کو ابھارنے اور تمسک باللہ پیدا کرنے کو اپنا مقصدِ وحید سمجھتا ہے لیکن اس میں، معاف فرمائیے، یہ خامی ضرور ہے کہ اگر ایک اور شخص طلوعِ اسلام سے زیادہ قوت، ہمت اور تنظیم سے عین وہی کام کرنے کو اٹھے اور بدقسمتی سے ہمارے اربابِ حل وعقد کے ذاتی مفاد اس شخص یا گروہ کے تہیہ، خدمتِ خلق کے پروگرام اور طریقِ کار سے ٹکرائیں تو طلوعِ اسلام میں اس جرأت کی کمی ہے کہ وہ پارٹی بازی کے مکروہ اثر سے بلند ہو کر مقتدر صاحبان کے مقابلہ میں اس کی ہمنوائی کرے۔ مثلاً

آپ کو معلوم ہے کہ ہندوؤں کے تعصب، تنگدلی، دنائت وسفاکی، بزدلانہ وقزاقانہ شمشیر بکفی اور بعد از تقسیم برصغیرِ ہند، مسلمانانِ ہندوستان کی بے بسی، بے کسی، بے سروسامانی، کس مپرسی اور تباہ حالی وبربادی کو دیکھکر علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی نے "انڈوپاکستان اسلام لیگ" کی بنا صرف اور صرف اس لئے ڈالی تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بطور قوم صفحۂ ہستی سے مٹائے جانے سے بچانے کی خاطر ہندوستان کی تقسیم (بعد از قیامِ پاکستان) بہ تناسب آبادی اس طرح سے کرائی جائے کہ وہاں کے چار کروڑ مسلمان پاکستان کے ملحقہ علاقوں میں آباد کئے جائیں۔ اور وہ علاقے پاکستان سے ملائے جائیں۔

لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس تجویز، نہ صرف تجویز، بلکہ اس عملی اور بے مثال تحریک کے قیام سے ہماری حکومت کے جبینِ ناز پر، جناب جلالتمآب پنڈت نہرو کے احتجاج پر، قہر بار تیوری آئی اور اس نے علامہ موصوف کی مذکورہ تحریک کو بزور مٹایا۔ لیکن طلوعِ اسلام کو حکومت کی اس غلط کاری پر مخلصانہ تنقید تک کی ہمت بھی نہیں ہوئی۔ حالانکہ اب وہ خود رقمطراز ہے:۔

> ہندوستان کے مسلمانوں کی نجات کی صورت بھی ملک کی مزید تقسیم ہے۔ اول وآخر یہ کرنا ہوگا لیکن ہندو اس پر کبھی رضامند نہیں ہوگا جب تک اسے قوت کے زور پر رضامند نہیں کیا جائے گا۔ لہٰذا پاکستان کے مسلمانوں کے لئے اندرونی قوت نہ صرف اپنے استحکام اور اپنے آپ کو ہندوؤں کے مشئومہ عزائم سے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے بلکہ ہندوستان کے چار کروڑ مسلمان کو شدھ ہونے سے بچانے کے لئے بھی اس کی اشد ضرورت ہے۔

اب آپ ہی بتلائیے کہ ان اعتراض پر جب ایک مخلص اور منظم کوشش باتوں اور مشوروں سے بڑھ کر عملاً کی جائے تو اس میں کیا عیب اور کونسا ہرج ہے؟ اور کیا طلوعِ اسلام کو پارٹیوں اور ناموں کے اثر سے بلند ہو کر ایسے لوگوں کی ہمنوائی نہیں کرنی چاہیئے۔

(ب) قیام نظام الٰہی کے لئے طلوع اسلام خود بھی کوشاں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام کی یہ پکار عملی دنیا میں ایک بے بضاعت آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور ایک عالمگیر نظام کے قیام کے لئے منظم اور جماعتی جدوجہد ناگزیر ہے! اس حقیقت سے آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ اس وقت ملک بھر میں نظامِ الٰہی کے قیام کے لئے جس قدر تندہی سے جماعت اسلامی کام کر رہی تھی اس کا یہ منظم کام خدا اور رسول اور قرآن واسلام

کی متابعت میں اور ملک و ملت کی بہتری و بقا کے پیش نظر عمومی تعاون کا مستحق تھا۔ لیکن بد قسمتی سے اس پر بھی جب ہماری حکومت کے مزاج میں تکدر آیا اور اس نے قیامِ نظامِ الٰہی سے پہلوتہی کرنے کی خاطر جب جماعتِ ہذا کی زبان بندی کی تو طلوعِ اسلام نے جماعتِ اسلامی کو قادیانیت سے بھی بدتر قرار دیا۔ حالانکہ یہ کام حکومت کو کسی ملا ملونٹے سے کرانا تھا۔ مگر بد قسمتی سے اس معاملہ میں بھی طلوعِ اسلام کا دامن داغدار ہو کر رہ گیا۔

آپ نے نومبر کے شمارہ میں کہا تھا کہ جماعت اسلامی کا "قادیانیت کا بروز" ہونا" ہم کسی دوسری صحبت میں دلائل و براہین سے ثابت کریں گے۔" پبلک آپ کی اس حقیقت کشائی کا نہایت ہی بے قراری سے منتظر ہے۔

(۵) مختصر یہ کہ میری یہ مخلصانہ اور نیاز مندانہ رائے ہے۔ کہ طلوعِ اسلام کو تعصب سے بلند و بالا ہو کر کام کرنا چاہیے۔ کیونکہ حق کے ایک علمبردار پر حق کی حمایت، چاہے حق کہیں بھی ہو فرضِ عین ہے۔ امید ہے آپ میری ان مخلصانہ گزارشات کو برا نہ منائیں گے۔ کہ ؎

به نزدِ من آنکه نکوخواہِ تست
که گوید فلاں خار در راہِ تست

اور ان پر بوقت فرصت ٹھنڈے دل سے غور کر کے سالِ نو سے ملک و ملت کی خدمت اس قسم کی خامیوں سے مبرا ہو کر کریں گے۔ فقط والسلام۔

طلوعِ اسلام

ہمارے بھائی نے ایک طرف طلوعِ اسلام کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ ملک و ملت کی جو جو خدمات اس نے "جس دیانت، جس صداقت پسندی، جس محققانہ اور مومنانہ بے باکی، جس اخلاص و بے لوثی اور جس حق پژوہی اور ملت دوستی سے سرانجام دی ہیں وہ احاطۂ تحریر میں نہیں آسکتیں" اور اس کا شیوہ یہ بتایا ہے کہ یہ "ہر یہی برحق و صداقت بات کو ملک و ملت کی فوز و فلاح کی خاطر ہر وقتی اور ہنگامی اثر سے بالاتر ہو کر قلندرانہ کہہ گذرتا ہے"۔ اور دوسری طرف یہ اشارہ ہوتا ہے کہ جس شخص یا گروہ کے تبعیہ خدمتِ خلق کے پروگرام اور طریق کار سے "ہمارے اربابِ حل و عقد کے ذاتی مفاد" ٹکراتے ہیں تو طلوعِ اسلام میں اس جرأت کی کمی ہے کہ وہ پارٹی بازی کے مکروہ اثر سے بلند ہو کر مقتدر صاحبان کے مقابلہ میں اس کی ہمنوائی کرے۔

یعنی ایک طرف طلوعِ اسلام قلندرانہ بے باکی اور بے لوثی اور مومنانہ صداقت پسندی اور حق پژوہی کے جوہروں کا حامل ہے اور دوسری طرف اس کی حالت یہ ہے کہ اس کی نگاہ اربابِ اقتدار کی پیشانیوں کی طرف رہتی ہے۔ جس شخص یا گروہ کے کسی مسلک سے اُن پیشانیوں پر بل پڑ جاتا ہے، طلوعِ اسلام اس کی ہمنوائی سے خاموش ہو جاتا ہے، نہیں۔ بلکہ اربابِ اقتدار کو خوش کرنے کے لئے اس کی مخالفت بھی شروع کر دیتا ہے۔

ہم حیران ہیں کہ ایک ہی شخص کی زبان سے، ایک ہی ادارہ (طلوعِ اسلام) کے متعلق، ایک ہی وقت

میں، اس قسم کے دو متضاد خیالات میں سے کس خیال کو درست سمجھیں۔ ہمارے اس بھائی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جو شخص محض اربابِ اقتدار کی خوشنودی کی خاطر وہ روش اختیار کر لیتا ہے جو طلوعِ اسلام کی طرف منسوب کی گئی ہے اسے مومنانہ صداقت پسندی اور قلندرانہ بے باکی کا مظہر نہیں بلکہ ننگِ انسانیت، منافقت اور شرمناک رزالت اور سفاہت کا مجسمہ کہا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام کا شمار ان دو شقوں میں سے ایک ہی شق میں ہو سکتا ہے۔ ہمارے یہ بھائی خود ہی فیصلہ فرما لیں کہ وہ اسے کس شق میں شمار کرتے ہیں۔

طلوعِ اسلام ہر اُس شخص کو دعا دیتا ہے جو اس کی غلطیوں پر اسے آگاہ کرے، لیکن وہ اس سے کبھی متاثر نہیں ہوتا کہ کوئی اس کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ وہ جس بات کو حق سمجھتا ہے، اس کا اظہار بلا کم و کاست کر دیتا ہے اور محض اس لئے کر دیتا ہے کہ وہ تبیانِ حقیقت کو اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔ نہ اس لئے کہ لوگ اس کے متعلق اچھی رائے رکھیں کہ وہ جانتا ہے کہ لو اتبع الحق اھواءھم لفسدت السموات والارض ومن فیھن اگر حق لوگوں کی آراء کے تابع چلنے لگ جائے تو اس سلسلہ کائنات میں فساد ہی فساد رونما ہو جائے۔ لہٰذا ہم اپنے اس بھائی کے الزام کے جواب میں جو کچھ لکھ رہے ہیں وہ اس لئے نہیں کہ ان کی رائے کو اپنے موافق کر لیں بلکہ اس لئے کہ وہ اگر کسی غلط فہمی میں ہیں تو اس کا ازالہ ہو جائے۔ لیھلک من ھلک عن بینۃ ویحیی من حی عن بینۃ۔ جسے ہلاک ہونا ہے علی وجہ البصیرت ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے علی وجہ البصیرت زندہ رہے۔

ہمارے اس بھائی نے اپنے عائد کردہ الزام (خوشنودیٔ اربابِ اقتدار) کے سلسلہ میں دو باتیں لکھی ہیں۔

(۱) طلوعِ اسلام نے علامہ مشرقی کے "انڈو پاکستان لیگ" کی تائید نہیں کی کیونکہ ہماری حکومت اس کے خلاف تھی۔

ہمارے اس بھائی کے خط سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ طلوعِ اسلام کے سابقہ دور میں بھی اس کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے کہ یہ حقیقت بھی ان سے پوشیدہ نہیں ہو گی کہ طلوعِ اسلام جس بے باکی اور دھڑلے سے تحریکِ خاکسار کی تائید میں لکھا کرتا تھا اس کی مثال شاید ہی کہیں دوسری جگہ دکھائی دے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خاکساروں کی تائید آگ سے کھیلنے کے مرادف تھی۔ نہ صرف انگریز اور ہندو کی حکومت ہی ان کے خلاف تھی بلکہ پنجاب میں سر سکندر حیات خاں (مرحوم) کی وزارت بھی ان کے درپے تخریب تھی۔ مخالفتوں کے اس تمام ہجوم میں طلوعِ اسلام اپنے خونِ جگر سے ان کی تائید و مدافعت میں صفحوں پر صفحے لکھتا چلا گیا اور اس کے نتائج و عواقب کا کوئی خیال اس حق گوئی کی راہ میں اس کا عناں گیر نہ ہوا۔ اس سے نہ خاکساروں کی خوشنودی مقصود تھی اور نہ اربابِ اقتدار کی ذاتی مخالفت۔ طلوعِ اسلام اس لئے تائید کر رہا تھا کہ وہ اس تحریک کو حق و صداقت پر مبنی سمجھتا تھا اور ملت کے لئے مفید۔

ظاہر ہے کہ جس طلوعِ اسلام نے اس وقت علامہ مشرقی کی تحریک کی تائید کی جب اس کی تائید میں

ہر طرف سے خطرات کا اندیشہ تھا۔ تو اگر وہ علامہ صاحب کی اس تحریک (انڈو پاکستان لیگ) کو ملت کے لئے مفید سمجھے تو اس کی تائید میں کوئی امر مانع ہو سکتا ہے؟ ہم اس تحریک کو تدبر اور اخلاص دونوں سے عاری سمجھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ ہماری اس رائے کو غلط سمجھیں لیکن یہ کہہ دینا کہ چونکہ ارباب حکومت اس کی مخالفت کرنا چاہتے تھے اس لئے ہم نے اس کی تائید نہیں کی بڑی زیادتی ہے۔

اب دوسری مثال لیجئے۔ آپ نے کہا ہے کہ جب حکومت نے اسلامی جماعت کو اپنی مصلحتوں کے خلاف سمجھا تو ہم نے بھی اس کی مخالفت شروع کر دی اور حکومت کے ایما پر وہ کام کیا جو انگریزوں کے زمانہ میں "ملا ملائے" کیا کرتے تھے! اس کے لئے ہم پھر یہی عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ہمارے اس بھائی نے طلوعِ اسلام کے سابقہ دور کا مطالعہ کیا ہے۔ تو انھیں یہ یاد ہوگا کہ طلوعِ اسلام نے اسلامی جماعت کے مسلک کے خلاف (۱۹۴۲-۱۹۴۱ء) میں اس وقت آواز اٹھائی تھی جب حکومت کے بڑے سے بڑے افسر اس جماعت کے ہمنوا ہوا کرتے تھے۔ ہم نے اس وقت بھی کہا تھا اور اس کے بعد اس حقیقت کو اب پھر بار بار دہرایا ہے کہ اس راہ میں ہم اور اسلامی جماعت کس حد تک رفیقِ سفر ہو سکتے ہیں اور کہاں سے ہم میں اور ان میں فراق بینی و بینکم شروع ہو جاتا ہے۔ اگر آج بھی اسلامی جماعت اپنے اس مسلک کو بدل لے جسے ہم غلط سمجھتے ہیں تو ہمارا پورا تعاون ان کے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کے ساتھ ان کے اس غلط مسلک سے پہلے ہوا کرتا تھا۔ لہٰذا جب طلوعِ اسلام نے یہ اختلافی آواز ۱۹۴۲-۱۹۴۱ء میں اٹھائی تھی تو یہ کہنا کہ جس وقت اس نے دیکھا کہ اربابِ حکومت اسلامی جماعت کے خلاف ہیں تو اس نے بھی مخالفت شروع کر دی، کس قدر واقعات کے خلاف ہے۔

جس زمانہ میں احرار کی تحریک زوروں پر تھی، ان کی عام روش یہ ہوتی تھی کہ جونہی کسی نے ان کے خلاف کوئی بات کہی تو انھوں نے چلا کر کہہ دیا کہ یہ مرزائی ہے۔" بس اس کے بعد اس بچارے کو جان بچانی مشکل ہو جاتی تھی۔ یہ ذہنیت احراریوں تک ہی محدود نہ تھی۔ ہم لوگوں کی عام طور پر یہ حالت ہو رہی ہے کہ جس بات کو ہم درست سمجھتے ہیں، اگر کوئی اس کی موافقت میں کچھ کہتا ہے تو ہم ہر جگہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور اسے حق و صداقت کا علمبردار قرار دیتے ہیں لیکن جو شخص اس کی مخالفت کرتا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم سوچیں کہ اس کے پاس اپنے اس مسلک کی تائید میں کیا دلائل و براہین ہیں، فوراً نعل برآتش ہو جاتے ہیں پھر اس کی طرف ذلیل سے ذلیل مقاصد (Motives) منسوب کر کے خوش ہو جاتے ہیں کہ ہم نے اس کی مخالفت کو ختم کر دیا۔

آخر میں ہم اپنے اس بھائی کی خدمت میں صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اگر انھوں نے طلوعِ اسلام کے ایک سال کے پرچے پڑھنے سے اس کے متعلق یہی اندازہ لگایا ہے کہ اس کی طرف سے مسائل و معاملات کی مخالفت یا موافقت ارباب اقتدار کے ایما پر ہوتی ہے تو وہ جو پیسہ طلوعِ اسلام خریدنے پر صرف کرتے ہیں اسے کسی بہتر مصرف میں لگائیں۔ اگر طلوعِ اسلام ایسا ہی بددیانت ہو تو اس پر پیسہ خرچ کرنا سخت گناہ ہے اور اگر وہ دیانتدار لیکن آپ کو بددیانت نظر آ رہا ہے تو طلوعِ اسلام کو کسی ایسی نگاہ کے سامنے جانے دیجئے جس میں یہ نقص نہ ہو۔

پاکستان مسلم لیگ کی تنظیم جدید

(ایک جائزہ)

غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت، آل انڈیا مسلم لیگ، تقسیم کے ساتھ پاکستان مسلم لیگ اور ہندوستان مسلم لیگ میں تقسیم ہوگئی۔ فروری ۱۹۴۸ء میں پاکستان مسلم لیگ کونسل نے فیصلہ کیا کہ پاکستان میں مسلم لیگ کو از سرِ نو منظم کیا جائے اور اس کے لئے نئے انتخابات عمل میں لائے جائیں۔ یہ گرانقدر فریضہ چودہری خلیق الزماں کے سپرد ہوا۔ چودہری صاحب نے سابقہ مسلم لیگی نظام کو معطل کر کے انتخاباتِ نو کا اعلان کیا۔ یہ انتخابات ابتدائی لیگوں سے لے کر مرکزی لیگوں تک کے ہونے تھے۔ گویا پاکستان میں مسلم لیگ کی از سرِ تا پا تجدید و تنظیم کرنی تھی۔ چودہری صاحب کے لائحہ عمل اور اوقات نامہ کے مطابق اس تنظیمِ جدید کو گذشتہ جولائی میں مکمل ہو جانا چاہیئے تھا، لیکن یہ مہم ابھی تک مکمل نہیں ہو سکی۔ بہرکیف نئی پاکستان مسلم لیگ کونسل کے اولین اجلاس کے انعقاد کی توقع فروری میں کی جا رہی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس کا جائزہ لیں کہ مسلم لیگ کی تنظیمِ نو کن خطوط پر ہوئی آپ اس حقیقت کو خصوصیت سے پیشِ نظر رکھئے کہ سابقہ آل انڈیا مسلم لیگ نے پاکستان کے نصب العین کے صداقت کی بنا پر بساطِ سیاست پر ایک جداگانہ اور ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے دیگر سیاسی احزاب کو اس کے سامنے سپر ڈال دینا پڑی۔ اس مطالبہ کے مؤید غیر منقسم ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت تھی، ان مویدین میں وہ سب مسلمان بھی پیش پیش تھے جنہیں اقلیتی صوبوں کے مسلمان کہا جاتا تھا اور جن میں کا خوش فہم ترین بھی یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ اگر پاکستان قائم ہو گیا تو ان کا علاقہ حدودِ پاکستان میں شامل ہوگا۔ پاکستان کے حق میں یہ اہم ترین دلیل دی جاتی تھی کہ اس سے نہ صرف وہ مسلمان آزاد اور محفوظ ہو جائیں گے جو حدودِ پاکستان میں ہوں گے بلکہ پاکستان بعینہٖ مسلمانانِ ہند کے تحفظ کا ضامن بھی ہوگا۔ اس تصورِ آزادی اور ضمانتِ حفاظت کے علاوہ مسلمانوں کے پیشِ نظر یہ عظیم الشان مقصد بھی تھا کہ انہیں ایک ایسا خطۂ ارض مل جائیگا جہاں وہ قرآنی نظامِ حکومت کو نافذ و رائج کر سکیں گے۔ اس نشاطِ تصور سے وہ نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر دیوانگی اور عشق سے مسلم لیگ سے وابستہ ہو گئے۔ ان کی مسلم لیگ سے وابستگی درحقیقت تصورِ پاکستان سے وابستگی تھی، اور یہ تصور ایک سیاسی تصورِ وطن ہی نہیں تھا بلکہ اس نظامِ حیات کا تصور تھا جس کا حامل

قرآن ہے اور جس کی تنفیذ و ترویج کا باعث خطۂ ارض پاکستان ہو سکتا تھا۔ مسلم لیگ نے مسلمانانِ ہند کو ایک علم اور ایک مقصد تو ضرور دیا لیکن جس سیاسی ماحول میں اور جن سیاسی حریفوں سے اسے پاکستان کی جنگ لڑنا پڑی اس نے مسلمانانِ ہند میں وہ حقیقی شعور قومی پیدا نہ ہو سکا جو روحِ قومی کو بیدار کر کے ملی انا کو اظہار و تربیت کے مواقع بخشتا ہے۔ دس کروڑ کی بھیڑ سے چند متفقہ نعرے تو ضرور بلند ہونے لگے اور ملمع وحدت نے قلب و نگاہ میں ایک گونہ حرارت بھی پیدا کر دی لیکن جب ملت کو وطن عطا ہوا تو پہلے قدم پر ہی "ملت" کی قلعی کھل گئی۔ جس ہجوم کو "جمیعًا" سمجھا جا رہا تھا اس کے دل آپس میں پھٹے ہوئے تھے۔ مقاصدِ عالیہ اور مفاداتِ ملی بالعموم ان نظر فریب پردوں کے نام تھے جن میں خود غرضیوں اور ملت فروشیوں کے دیو ناچ رہے تھے۔ ملک ہاتھوں میں آیا مگر ملت کی آنکھیں اس سے دکھلیں!

قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی بدبختی سے ہندوستان میں مسلمانوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا۔ مسلمان بحیثیت مسلمان ہندوؤں اور سکھوں کے رحم و کرم پر ہو گئے اور بیت حد تک شکست خوردہ اخود پاکستانی حدود کے اندر مسلمان بری طرح مایوس اور متاسف ہوئے؛ وہ غیر معمولی حوادث و نوازل کا شکار ہوئے اور ان کے محبوب لیڈر جنہیں انہوں نے دیوانہ وار ووٹ دیئے تھے ان کی بیشتر توقعات پوری کرنے سے قاصر رہ گئے۔ تسکین کی ایک صورت "اسلامی حکومت" کے تصور سے تھی۔ اس کے متعلق جس پریشاں خیالی اور عملی استہزار کا مظاہرہ ہوا اس سے امید کا یہ آخری سہارا بھی ٹوٹ گیا۔

ان غیر متوقع اور کمر شکن مصائب کے لئے قوم ہرگز تیار نہیں تھی۔ نعرہ باز قوم تلخ حقائق کے مقابلہ کے لئے تیار کیسے ہوتی! ان میں سے کسی نے بھی اس آنے والے طوفانِ خون و مرگ کا اندازہ نہیں کیا تھا اور اگر کسی کی نگاہ اس کا دھندلا خاکہ دیکھ بھی سکی تو اس نے اپنے تاثرات سے قوم کو آگاہ کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ سابقہ لیڈروں کے خلاف ہمہ گیر عدم اطمینان قابلِ فہم اور قدرتی ہے۔ وہ عوام جو اسلامی حکومت کو سامنے آتا دیکھ رہے تھے اور اس سے مطابقت کی تیاری کر رہے تھے وہ پھر آنکھیں میچ کے پڑ رہے۔ اب کہ وہ سو نہیں گئے، سو نہیں سکتے! وہ پیچ و تاب کھا رہے ہیں۔ وہ یقین نہیں کر سکتے کہ

درویشی بھی عیاری ہے، سلطانی بھی عیاری!

وہ اس نظام سے جسے بغرضِ سہولت فہم ہم "پاکستانی نظام" کہنا چاہتے ہیں، بدستور سابق غیر متعلق یا غیر متاثر نہیں۔ وہ انگریزی نظام سے غیر متاثر رہ سکتے تھے، کیونکہ وہ ان کا اپنا نظامِ حیات نہیں تھا۔ وہ "پاکستانی" نظامِ حیات سے کیسے دور رہ سکتے ہیں؟ ان میں جذباتِ غیظ و غضب ابھر رہے ہیں۔ ہمالہ کے چشمے پھر سے کب پھوٹتے ہیں؟ یہ صدیوں کی سوئی ہوئی قوم کب بیدار ہوتی ہے؟ اس کا حسابی اندازہ ناممکن ہے، لیکن جب جامد سے جامد ملت بھی حاضر و موجود سے بیزار ہو جاتی ہے تو وہ سوئی نہیں رہ سکتی۔ بیزاری علامت ہے بیداری کی۔ یہ علامات قبل از وقت ہو سکتی ہیں، غلط نہیں ہو سکتیں!

پاکستان کی حکومت مرحوم آل انڈیا مسلم لیگ کی قائم کردہ ہے۔ اس مرنے والی میں بہت سی خوبیاں تھیں لیکن اس کے خلف "پدر سلطان بود" تو سینہ تان کر کہہ سکتے ہیں مگر "تراچہ" کا جواب ان کے پاس نہیں۔

یہ موقع حکومت کی انتظامی خوبیوں یا خامیوں پر تبصرے کا نہیں، اسی لئے ہم محض اشارات پر اکتفا کرتے ہیں اور اس حقیقت کا احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ان بدلے ہوئے حالات میں پاکستان میں مسلم لیگ کی سابقہ ممتاز حیثیت باقی نہیں رہی۔ ملت اس کی حکومت کے متعلق وہ حسن ظن ہرگز نہیں رکھتی جو اسے اس جمعیت سے تھا۔ یہ ایک روشن حقیقت ہے اور اس کا بطلان ناممکن ہی نہیں خطرناک بھی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حالات مسلم لیگ سے متنفر ہونے کی علامت نہیں بلکہ ثبوت ہیں کہ جمعیت کو پھر سے میدان میں آکر اپنے آپ کو "بحال" کرنا چاہئے۔ بظاہر یہ صحیح معلوم ہوتا ہے اور مسلم لیگ کے انتخابات اسی عزم و اقدام کا پتہ دیتے ہیں لیکن اب آئیے دیکھئے ان انتخابات کے جلو میں کیا ہوا یا ہو رہا ہے!

قیام پاکستان سے پیشتر کارکنان مسلم لیگ کے لئے مقامات عز و جاہ مناصب لیگ تھے۔ چنانچہ وہ خدمت اور محنت کے طویل اور غیر یقینی راستہ سے یا مجلسی حیثیت سے کہ وہ اکثر موروثی ہوتی تھی کے مختصر، سہل اور یقینی راستہ سے جاعتی عہدوں تک پہنچا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ سے وابستگی میں ایک اور دلکشی بھی پیدا ہو گئی۔ یہ دلکشی زیادہ جاذب اور نشہ آور ہے۔ پہلے مسلم لیگ سے وابستگی سے صدارت وغیرہ قسم کا کوئی عہدہ میسر آنے کی امید ہوا کرتی تھی۔ اب اس وابستگی کا نتیجہ وزارت بھی نکل سکتا ہے۔ اس دوگونہ دلکشی نے جاہ پرستوں کو مسلم لیگ کا گرویدہ بنا دیا ہے۔ عہدوں اور مناصب کی ہوس نے ان دشمنان لیگ کو پکا لیگی بنا دیا ہے جو آج تک اس میں شمولیت نہیں اختیار کر سکے تھے۔ ان "نو واردوں" سے مسلم لیگ میں دو طبقے بن گئے ہیں۔ ایک طبقہ ان فائزین مرام کا ہے جو اس وقت لیگ کے نامزدگان کی حیثیت سے وزارتوں پر متمکن ہیں۔ دوسرے طبقے میں ایک طرف تو وہ حضرات ہیں جو لیگی ہونے کے باوصف اتنے خوش قسمت ثابت نہ ہوئے کہ انھیں وزارتوں سے نوازا جاتا یا اگر انھیں نوازا گیا تو انھیں خوبتر مناصب کی ہوس میں حاصل شدہ منصب کو بھی ہاتھ سے چھوڑ دینا پڑا۔ دوسری طرف اس طبقہ میں وہ اصحاب ہیں جنھیں ہوس مناصب کشاں کشاں حلقہ لیگ میں لے آئی ہے۔ دوسرے طبقہ کے دونوں ذیلی گروہ باہم متفق نہیں لیکن اشتراک اغراض نے انھیں مشترک "مغاصب" کے مقابلہ میں اکٹھا کر دیا ہے۔

مسلم لیگ کی فروری کی ایک منظور شدہ قرارداد کے مطابق ارکان حکومت مسلم لیگ کے عہدہ دار نہیں ہو سکتے۔ اس فیصلہ سے موجودہ ارباب حکومت جو کبھی مسلم لیگ کے عہدہ دار تھے اب مسلم لیگ کے عہدہ دار نہیں رہے۔ لیکن چونکہ وزراء مسلم لیگی ہیں اور مسلم لیگی ہونے کی حیثیت سے انھیں مسلم لیگ کے ضابطہ اور نظام کے سابق چلنا چاہئے اس لئے جاعت یعنی مسلم لیگ کو وزارتوں پر فوقیت اور برتری حاصل ہے۔ اس برتری کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ جاعتی دباؤ سے وزارتوں کو جھکایا اور "مطیع" کیا جا سکتا ہے اور دوسرا پہلو یہ کہ وزارتوں تک پہنچنے کا یہ ایک وسیلہ بھی ہے۔ کام جوئیوں اور ہوس رانیوں کی اس جنگ میں خدمت اور خلوص کے جذبات کا جو حشر ہو سکتا ہے اس کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ مسلم لیگ کا سٹیج اب تک امرا کا خصوصی اجارہ چلا آیا ہے۔ ایسی ایک بھی مثال نہیں ملتی کہ کوئی شخص گمنامی سے محض ذاتی جوہر کی بنا پر مسلم لیگ میں امتیاز حاصل کر سکا ہو۔ بنا بریں عوامی کارکن ابتدائی لیگوں میں تو ملتے ہیں

اعلیٰ اداروں میں ان کا پتہ نہیں چلتا۔ اس کے برعکس امیر ابنائے وقت نے خوب فائدہ اٹھایا اور وہ دولت کے زور سے مسلم لیگ پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے عام اس سے کہ ان کا ماضی کسی طرح ہی کیوں نہ گذرا ہو۔ چنانچہ قیام پاکستان کے بعد بھی سیاسی "قلب ماہیت" کا سلسلہ تیز تر ہو گیا اور خلاف مسلم لیگ حضرات جوق در جوق حلقہ بگوش لیگ ہوتے گئے۔ لیگی نظام تو معطل تھا ہی، جس شخص نے بھی مسلم لیگ کا "کلمہ" زبان سے پڑھ لیا وہ اس کی "جنت" میں داخل ہو گیا۔

مسلم لیگ کی حیثیت، جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے، یہ ہے کہ وہ وزارتوں (حکومتوں) کی محاسب ہو اور حکومتیں اس کے سامنے جوابدہ ہوں۔ اس لئے جن دو طبقوں کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں، ان ہر دو نے جماعت کو اپنی اغراض کا آلہ کار بنانے میں ایڑی چوٹی تک کا زور لگایا۔ ارباب حکومت کو یہ تردد تھا کہ اگر ان کے مخالفین جماعت پر قابض ہو گئے تو ان کا سفر پر صعوبت ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ ساعی رہے کہ مسلم لیگ میں وہ حضرات منتخب ہو کر آئیں جو ان کے اعمال کا محاسبہ کرنے کی بجائے ان سے اغماض برتیں، بلکہ جن کی آڑ میں وہ اپنی حکومتوں کو مستحکم تر بنا لیں۔ اس کے برعکس دوسرے یعنی غیر وزیر گروہ نے شبانہ روز کوشش صرف کر دی کہ مسلم لیگ میں اکثریت ان کے ہم خیالوں اور حکومت کے مخالفین کی ہو تاکہ وہ اکثریت کے دباؤ سے وزارت کو اپنے اشارۂ چشم و ابرو پر رقص کرا سکیں۔

اس اجمالی عمومی تبصرہ کی روشنی میں دیکھئے کہ مختلف صوبوں میں دونوں گروہوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں کئے اور ملت اسلامیہ پاکستانیہ کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت کو کن خطوط پر منظم کیا۔ صوبہ سرحد سے شروع کیجئے۔ سرحد کا وہ پر خلوص و مخلص طبقہ جو پاکستان میں سلطانیٔ جمہور کے خواب دیکھ رہا تھا مسلم لیگ نے اس کی کبھی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ انتخابات اور استصواب میں تو مسلم لیگ نے ان کے ووٹوں پر نگاہ رکھی لیکن جب ان کو شریکِ حکومت کرنے کا وقت آیا تو مسلم لیگ نے حسب عادت انھیں نظر انداز کر دیا۔ حکومت کے موجودہ تصور سے یہ طبقہ عوام یوں بھی متنفر تھا اور یہ حکومتی اداروں میں کسی قسم کی رسائی کا چنداں متمنی نہ تھا۔ ان کا تقاضا ایک عادلانہ انداز حکومت کا تھا جو انھیں اظہار و پرورش خودی کے زیادہ سے زیادہ مواقع بہم پہنچائے۔ وہ کسی طبقہ کے تسلط کا اتنا مخالف نہ تھا جتنا عوامی ترفیع کا طالب۔ مسلم لیگ کے حالیہ انتخابات میں اس طبقہ کو طاق نسیاں کا گلدستہ بنا دیا گیا۔ مسلم لیگ کا کہنا ہے کہ ابتدائی ارکان کی بھرتی کے لئے چھ لاکھ میثاق ہائے رکنیت صوبہ سرحد میں تقسیم ہوئے۔ چھ لاکھ فارم تو ایسا کار نمایاں نہیں۔ صوبہ سرحد کی آبادی اس سے سات گنا زیادہ ہے۔ عوامی طبقہ نے احتجاج کیا اور مزید فارموں کیلئے شور مچایا مگر انھیں یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ مزید فارم موجود نہیں۔ یہ وجہ قابل پذیرائی ہو سکتی ہے کہ فارموں کے محدود ذخیرہ میں سے غیر محدود فارم نہیں دیئے جا سکتے لیکن امیدوارانِ رکنیت کو یہ آزادی تو دی جا سکتی تھی کہ وہ از خود فارموں کی نقلیں بنا لیں اور ان کی خانہ پری کر کے رکنیت کی کوشش کریں۔ رکنیت کے لئے لیگ کا چھپا ہوا فارم تو ناگزیر شرط نہ تھی۔ ویسا فارم تیار کیا جا سکتا تھا اور اسی مصرف میں لایا جا سکتا تھا۔ جہاں تک مشتہر چھ لاکھ فارموں کا تعلق ہے وہ چند منتخب آدمیوں کے ہاتھوں میں دیئے گئے اور منتخب آدمیوں کو ابتدائی رکن بنایا گیا۔ محض یہی نہیں کہ فارم

مخصوص حلقوں میں تقسیم ہوئے بلکہ فارموں کی تعداد کے مقابلہ میں بہت کم رکنیت کا چندہ وصول کیا گیا، بہت کم وصول کرنے کی کوشش کی گئی۔ رکنیت کا چندہ صرف گنتی کے سربرآوردہ حضرات سے وصول کیا گیا۔ چنانچہ اس طرح جو "انتخابات" ہوئے وہ بقول شخصے نامزدگیوں سے زیادہ وقیع نہیں۔ یہ نامزدگیاں ان حضرات کی طرف سے ہوئیں جن کے اعمال کی محاسب نئی مسلم لیگ بننے والی ہے! ہم اس اصولی بحث میں شخصی تنقید میں الجھنا نہیں چاہتے لیکن یہ دکھانے کے لئے کہ مسلم لیگ نے سابقہ غلطیوں سے مطلقاً کوئی سبق حاصل نہیں کیا یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ صوبہ سرحد کے انتخابات کی نگہداشت کا فریضہ اب کے پھر قاضی عیسیٰ صاحب کے سپرد ہوا۔ قاضی صاحب کی ذات گرامی ۱۹۴۵ء کے عمومی انتخابات میں اسی خدمت پر مامور ہوئی تھی اور سرحد میں مسلم لیگ کو شکست کھانا پڑی تھی۔ اب شکست کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ کسی حریف سے مقابلہ ہی نہیں۔ لہٰذا عام طور پر یہ محسوس بھی نہیں ہوگا کہ قاضی صاحب کی تخم ریزی کے ثمرات کیا ہوں گے؟

سرحد کے بعد مغربی پنجاب کو لیجئے۔ اس اہم ترین اور علی قدر تناسب بدقسمت ترین صوبہ کی عنان وزارت ممدوٹ صاحب کے قبضہ میں ہے۔ ممدوٹ صاحب نے حال ہی میں اعتراف کیا ہے کہ قائداعظم نے ان کو صوبائی وزارت عظمیٰ کے لئے نااہل قرار دیا تھا۔ اس بطل بزرگ کی اس قطعی سند کے باوصف آپ محض وزارت سے چپکے ہوئے ہی نہیں بلکہ ان کی تگ و دو کا محور یہی کچھ ہے کہ ان کی وزارت بحال رہے اور ان کے جی حضوری ان کے گرد جمع رہیں میاں ممتاز دولتانہ کبھی ممدوٹ صاحب کے شریک وزارت تھے لیکن پھر اس رفاقت سے دستکش ہوگئے۔ جب آپ دونوں اشتر وزارت کے کجاوہ نشین تھے تو بانگ دہل اعلان فرمایا کرتے تھے کہ ان کی وزارت بہترین وزارت ہے اور صوبہ کی صحیح خدمت گذار۔ لیکن جب دولتانہ علیحدہ ہوگئے تو ان کے نزدیک وزارت نااہلوں اور ناتجربہ کاروں کا مجموعہ بن کے رہ گئی۔ ممدوٹ صاحب نے عدم کارگزاری کی ذمہ داری دولتانہ صاحب کے سرتھوپی اور دولتانہ صاحب نے ممدوٹ صاحب کو مورد الزام قرار دیا۔ دونوں کی الزام تراشی سے یہی ثابت ہوتا تھا کہ وزارت وہی بھلی جس میں صاحب بیان شریک ہو۔ اس سیاسی رسہ کشی میں صوبائی مسلم لیگ کے انتخابات برپا ہوئے۔ دونوں نے مسلم لیگ کی خالی نشستوں پر للچائی ہوئی نظریں ڈالیں۔ صوبائی انتخابات اصول اور مقاصد کی اساسات پر نہیں ہوئے بلکہ شخصی اور ذاتی رجحانات پر۔ دونوں گروہ دیوانہ وار زیریں اور بالائی ادارے "فتح" کرنا چاہتے تھے۔ اس ضمن میں انھوں نے کس قسم کے اخلاق عالیہ اور اوصاف حمیدہ کا مظاہرہ کیا؟ یہ موقع اس شرمناک داستان کے چھیڑنے کا نہیں۔ صوبائی انتخابات کا رخ ازبسکہ ضلعی انتخابات سے متعین ہونا تھا اس لئے بڑی بڑی توپوں کے دہانے ضلعوں کی طرف پھیر دیئے گئے۔ اس مقابلہ میں صاحب اقتدار پارٹی مات کھا گئی اور وزارت سے نکلی یا نکالی ہوئی پارٹی کی جیت ہوئی۔ عوام نے اس دلخراش ڈرامے میں کیا پارٹ ادا کیا؟ اس کا قیاس ذرا مشکل ہے۔ رائے عامہ نہ ہونے سے عوام بمنزلہ صفر ہیں ان کے ووٹ بوقت ضرورت حسب منشا حاصل اور استعمال کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد ان کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ وہ بدستور سابق راندے اور دبے رہتے ہیں۔ وہ ستارے کو چھوڑ کر چاند کو سجدہ کرتے ہیں لیکن رب مقصود

ان کا نہ وہ ہوتا ہے نہ یہ۔ وہ بے زبان ہیں اور بے بس۔

اب مغربی پنجاب کی یہ کیفیت ہے کہ وزارت ممدوٹ صاحب کے ہاتھ میں ہے اور صدارت دولتانہ صاحب کے ہاتھ میں۔ ایک وزیر اعظم ہے، دوسرا وزیر رہ چکا ہے اور وزیر اعظم بننے کا حریص۔ ایک کی کوشش یہ ہے کہ دوسرے کو وزارت سے جائز و ناجائز ذرائع سے بے دخل رکھا جائے، چنانچہ اس نے جماعت کو پوری طرح جی حضوریوں کے تسلط میں لانا چاہا۔ گو ناکام رہا۔ دوسرے کی کوشش یہ کہ وہ اپنے حریف کو نیچا دکھائے اور خالی نشست پر خود قابض ہو جائے۔ چنانچہ اب وزارت اور صدارت میں استخوان نزاع حکومت ہے۔ وزارت حکومت برقرار رکھنا چاہتی ہے اور صدارت حکومت چھیننا چاہتی ہے۔ صوبے کا اللہ مالک! مہاجرین کی بحالی، عوام کی مشکلات کا حل، صنعتی ترقی، ملکی رفاہ و بہبود، افلاس اور بھوک کا علاج، وغیرہ مسائل مہم طاق نسیاں کی زینت ہیں۔ اس ادھیڑبن میں ادھر توجہ دی ہی نہیں جا سکتی۔

بعینہٖ اسی قسم کا کھیل سندھ میں کھیلا گیا۔ سندھ کے سابق وزیر اعظم مسٹر کھوڑو کے خلاف متعدد الزامات ہیں جن کی سماعت سپیشل ٹریبونل کے سامنے ہو رہی ہے۔ ٹریبونل کے فیصلہ سے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، فیصلہ تک مسٹر کھوڑو کی پوزیشن ظاہر ہے۔ مگر اسی عالم میں معرکہ انتخاب برپا ہو گیا۔ چودھری خلیق الزماں صاحب نے اپنے بیان کے مطابق مسٹر کھوڑو کو مجبور کیا کہ وہ صدارت کے لئے نہ کھڑے ہوں۔ وہ رضامند ہو گئے۔ کاغذات نامزدگی داخل ہو رہے تھے اور آخری وقت قریب تر آ چکا تھا کہ وزارتی پارٹی نے اپنے نمائندے کے کاغذات داخل کر دیئے۔ مسٹر کھوڑو یہ گوارا نہ کر سکے۔ وہ خلیق الزماں صاحب کے بازر کھنے پر بھی بضد رہے اور اپنے سابقہ فیصلہ کو بدل کر انہوں نے اپنے کاغذات داخل کر دیئے۔ جب ہنگامہ فرو ہوا تو کھوڑو صاحب صدر منتخب ہو چکے تھے اور بھاری اکثریت سے۔ چودھری صاحب فرماتے ہیں کہ وہ مسٹر کھوڑو کو تبدیلی فیصلہ سے باز نہ رکھ سکے۔ لیکن اگر چودھری صاحب سے پوچھا جائے کہ جب وہ مسٹر کھوڑو پر دباؤ ڈال کر انہیں باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے تو انہیں یہ کیوں خیال نہ آیا کہ وزارتی پارٹی کو بھی اس اقدام سے باز رکھا جائے۔ وزارتی پارٹی کو یہ حق کیسے دیا جا سکتا تھا کہ وہ جماعت کو اپنے نامزد کے قبضہ میں لانے کی کوشش کرے۔

چودھری صاحب کے اصول کے مطابق اگر لیگ کے عہدہ دار ارکان حکومت نہیں ہو سکتے تو وزارتی پارٹی کے ارکان عہدوں پر کیسے مسلط کئے جا سکتے ہیں؟ یا ان کو یہ اجازت کیسے دی جا سکتی ہے کہ مسلم لیگ کے عہدوں کو اپنے نامزدگان سے پر کریں اور یوں جماعت کو اپنے ہی حضوریوں کی جماعت میں تبدیل کر لیں؟ اب مسٹر کھوڑو کے اقدام پر لاکھ طعن کیجئے، وزارت اور ناظم مسلم لیگ کے رویہ کو کیسے بہ نظر استحسان دیکھا جا سکتا ہے؟ کیا وہ اس افسوسناک نتیجہ کے باعث نہیں بنے؟ اب ہر چند مسٹر کھوڑو صدارت سے از خود مستعفی ہو گئے ہیں لیکن مجالس عاملہ وغیرہ ان کی نامزد کردہ ہے۔ اگر مسٹر کھوڑو از خود مستعفی نہ ہو جاتے تو صدارت و وزارت دو حریف گروہوں کے قبضہ میں ہوتیں۔ یہ دونوں گروہ کبھی معاون نہ ہو سکتے۔ اور صوبہ اور ملک نتیجہ کے طور پر نقصان اٹھاتے۔ ان کے استعفے سے اس فتنہ کی سرکوبی ہرگز

نہیں ہوئی۔ جو شجرۃ الزقوم بویا جا چکا ہے اس کا پھل چکھنا ہی پڑے گا۔

مشرقی بنگال کی تفصیلات منظر عام پر نہیں آئیں اور ہمیں افسوس ہے کہ ہم از خود مطلوبہ معلومات مہیا نہیں کر سکے وہ صوبہ بظاہر 'وزارت' اور 'صدارت' کی بھیانک جنگ سے محفوظ نظر آتا ہے لیکن وہاں ایک حقیقی خطرہ ہے جسے خصوصیت سے نگاہ میں رکھنا پڑے گا۔ یہ خطرہ کمیونزم کا ہے۔ بنگال ایسے 'باغیوں' کا گہوارہ رہا ہے۔ مشرقی بنگال کے گرد و پیش کمیونزم کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ ہندوستان، برما، چین، ملایا، جزائر شرق الہند وغیرہ علاقوں میں کمیونزم آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھوٹ رہی ہے۔ خود خلیق الزماں صاحب کو اس ضمن میں شکایت ہے کہ مشرقی بنگال میں اشتمالی طبقہ مسلم لیگ میں تشتت پیدا کر کے اور اس کی جمعیت کو پریشان کر کے اپنے لئے راستہ صاف کر رہا ہے۔ اشتمالیت بین الاقوامی سیاست کا سنگین مسئلہ ہے۔ پاکستان میں اس کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دی گئی اور صرف اس قدر کہہ کر ٹال دیا جاتا رہا ہے کہ مشرقی بنگال میں اشتمالیت اثر و نفوذ پیدا نہیں کر سکی، نیز اسلام کا مقابلہ اشتمالیت سے ناممکن ہے۔ یہ لفظی طفل تسلیاں اور خوش خیالیاں کسی وقت خلاف حقیقت ثابت ہو سکتی ہیں۔ یورپ اور ایشیا میں اشتمالیت جس برق رفتاری اور ناقابل شکست طریق سے تسلط جما رہی ہے اس کا مقابلہ الفاظ و امانی سے نہیں ہو سکیگا۔ اشتمالیت اپنے جلو میں کیا تبدیلیاں لاتی ہے؟ اس کی تفاصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں، لیکن وہ تبدیلیاں ہو سکتا ہے ہمارے خواہش کے خلاف ہوں اور بالکل ناگہانی وقوع پذیر ہو جائیں۔ خود مسلم لیگ کے حریم عافیت تک ان دور کے شعلوں کی حرارت پہنچ چکی ہے لیکن..... لفظی استخفاف پر بات ختم کر دی گئی ہے مشرقی بنگال کی مسلم لیگ اشتمالیت کے امکانات کو قطعاً نظر انداز نہیں کر سکتی۔

صوبوں کی حدود سے نکل کر اب ذرا عمومی فضا میں آیئے۔ ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے نفاذ نے ہندو کانگرس کو جو غلبہ اور تسلط بخشا اس سے مسلمانوں کے سامنے یہ اہم مسئلہ آ گیا کہ اگر انگریز اقتدار سے دستکش ہوا تو ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا مستقبل ہوگا؟ انتقال اقتدار کے بعد ان کی کیا حیثیت ہوگی؟ حکیم الامت کا عطا فرمودہ تصور موجود تھا اور قائد اعظم ایسا مدبر اس میں رنگ بھرنے کے لئے مستعد ہو گیا۔ ایک کے تصور اور دوسرے کی جدوجہد نے پاکستان بنا دیا۔ عوام اس جدوجہد میں شریک ہوئے تو محض ہاتھ کھڑا کرنے کے لئے۔ وہ تقسیم کے نتائج کے لئے تیار نہ ہو سکے، چونکہ مسلمانوں کی نام نہاد زندگی ایک سیاسی شعبہ سے متعلق تھی اس لئے سیاست کو خصوصی اہمیت حاصل ہو گئی اور ہر شعبہ پر سیاسین چھا گئے۔ ہمارے ان نام نہاد سیاسین کا طائفہ مشتمل تھا ان حضرات پر جو مطالبہ پاکستان سے پیشتر کی جنگ آزادی میں خاردزبوں ہو کر اپنے گھروں میں دبک کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ نہ اجنبی حکومت کے نزدیک قابل عزت رہا تھا نہ ملت کے نزدیک واجب الاحترام یا واجب الاتباع۔ بات کسی شعبہ سے متعلق ہو اس کی قیادت اسی طبقہ کو سونپ دی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مجلس دستور ساز اور مجالس مقننہ میں مسلمان ماہرین آئین و قانون نہیں آئے بلکہ محض ارباب سیاست۔ محض یہی نہیں بلکہ ایک شخص بیک وقت متفرق اداروں کا رکن بنا دیا گیا۔ مثلاً ایک صاحب صوبائی لیگ کے صدر بھی ہیں اور وزیر اعظم بھی، وہ صوبائی مجلس مقننہ کے رکن بھی ہیں اور مجلس دستور ساز کے بھی۔ پنجاب میں دولتانہ صاحب

کو لیجئے وہ صوبائی مجلس مقننہ کے رکن بھی ہیں اور صوبائی لیگ کے صدر بھی۔ یعنی ایک طرف تو انھیں جماعت نے عزت انتخاب بخشی، دوسری طرف وہ رکن مقننہ ہوتے ہوئے وزارت کے حقدار بھی ہیں۔ یعنی وہ دو کشتیوں کے سوار ہیں اور مکلف نہیں کہ کسی ایک کشتی کی سواری چھوڑ دیں۔ چونکہ وزارت میں اقتدار کی مزید دلکشی ہے اس لئے جو صاحب صدارت پر قابض ہوں گے وہ قدرتی طور پر اس دباؤ اور اثر کو حصول وزارت کے لئے استعمال کریں گے اور اس حصول کا قدم اول موجودہ وزارت کی تذلیل ہوگا۔

چودھری خلیق الزماں صاحب ناظم مسلم لیگ نے ۱۶ جون ۱۹۴۸ء کو فرمایا تھا:

ہم مسلم لیگ کی ایسے خطوط پر تنظیم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے عہدہ دار مجالس مقننہ کے لئے منتخب نہ ہوں۔

یہ اصول تو وضع کر لیا گیا لیکن اس پر عمل درآمد ہرگز نہیں ہوا۔ اگر یہ مسلّم ہے کہ مسلم لیگ کے عہدہ دار مجالس مقننہ کے رکن نہ ہوں تو اس کا الٹ بھی مسلّم ہونا چاہئے کہ مجالس مقننہ کے ارکان کو مسلم لیگ کے عہدیدار نہیں ہونا چاہئے۔ اس پر مطلقاً عمل نہیں کیا گیا اور نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں۔ اگر ایسا کر لیا جاتا تو جماعت اور حکومت کے دوائر مختلف رہتے اور یوں خلط ملط ہو کر مزید فساد کا باعث نہ بن جاتے۔ یعنی اگر ایک صوبائی صدر کو یہ معلوم ہو کہ وہ جماعتی ضوابط کے ماتحت وزارت پر حریص نگاہیں نہیں ڈال سکتا تو وہ منتخب ہونے سے پیشتر یہ فیصلہ کرلے گا کہ اسے کون سے دائرہ عمل کو ترجیح دینی چاہئے۔ جب وہ ایک بار انتخاب کرلے گا تو اپنی تمام تر توجہ اسی دائرہ پر مرکوز اور اسی تک محدود رکھے گا۔ وہ دوسرے دائرہ میں دخیل نہیں ہو سکے گا۔ اس سے یہ فساد اغراض ایک حد تک کم ہو سکتا ہے۔ لیکن یہاں تو فساد و تخریب کی صورت نام نہاد تنظیم جدید میں ہی مضمر ہے۔ ایسے خطوط پر منظم ہونے والی جماعت کو وزارتوں اور عہدوں کی جنگوں اور سازشوں سے ہی فرصت نہیں مل سکے گی۔ چودھری صاحب نے مسلم لیگ کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ عوام اور حکومت کے مابین رابطہ کا کام دیگی۔ نیز مسلم لیگ مضبوط اور موثر بن گئی تو وہ حکومت کو رائے عامہ سامنے جھکائیگی۔ یہ الفاظ عملاً مقدس خواہشات ثابت ہوں گے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم نے بتایا ہے، ارکان مسلم لیگ ارکان مجالس مقننہ ہونے کے باعث وزارتوں پر حریص نگاہیں ہی نہیں ڈالتے بلکہ ان کے حصول میں دیوانہ وار ساعی ہیں۔ یہ جماعت حکومت کو جھکا سکی تو عوام کے سامنے نہیں جھکائے گی بلکہ اپنے سامنے جھکائیگی۔ عوام بے چارے دونوں کے سامنے جھکے ہوئے ہوں گے۔ حکومت قانون کے ذریعہ ان پر مسلط و حاکم ہوگی اور جماعت جذبات کے زور سے ان پر قابض۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلم لیگ ایک ہر دلعزیز و مقبول نام تھا۔ یہ عزت و تکریم قیام پاکستان کے بعد ختم ہو گئی۔ اب اس نام کا غلط استعمال ہو رہا ہے اور اس کا فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ انتخابات نے جو نئی جماعت تیار کی ہے وہ بھان متی کا کنبہ ہے۔ اس میں یا تو وہ افراد ہیں جو اپنے موجودہ اجاروں اور حاصل شدہ اقتدار کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں یا وہ افراد جو ان افراد کو بے دخل کر کے خود ان پر تسلط جمانا چاہتے ہیں۔ یہ جماعت دوسروں کے اعمال کا "محاسبہ" کریگی لیکن عیب جوئی کی غرض سے اور اس نیت سے کہ ان کی کارگزاری میں سقم تلاش کر کے انھیں بدنام کیا جائے اور

اپنے لئے راستہ صاف کیا جائے، کیونکہ یہ راستہ ان کے لئے بدستور کھلا ہے۔

مسلم لیگ کا موقف حصول پاکستان تھا۔ اب جبکہ پاکستان حاصل ہو چکا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلم لیگ کے عزائم و مقاصد کیا ہیں محض یہی نہیں کہ اس کے عزائم و مقاصد کیا ہیں بلکہ اس کا طریق کار و لائحہ عمل کیا ہے۔ پاکستان مسلم لیگ ایک نئی جماعت ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان کے خاکہ میں رنگ بھرے گی۔ لیکن اس نے کبھی یہ بھی تو نہیں بتایا کہ پاکستان کا خاکہ کیا ہے۔ یہ نہ بتانا کوئی معمولی بات نہیں اور اس سے اہم نتائج — خواندہ اور ناخواندہ دونوں — پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً پچھلے دنوں چودھری خلیق الزماں صاحب نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مسلم لیگ نے جماعتی حیثیت سے کبھی مسلمانوں سے اسلامی حکومت کے قیام کا وعدہ نہیں کیا۔ اگر یہ کچھ کہا جا سکتا ہے تو پاکستان کے خاکہ کی تو بیشمار توجیہیں ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا استحکام پاکستان وغیرہ قسم کی نظر فریب اصطلاحات مبہم ہیں اور سیاست میں بال کی کھال اتارنے والے اپنے ہر اقدام کو اس کے مطابق بتا سکتے ہیں۔ ان حالات میں اشد ضروری تھا کہ ایک سیاسی جماعت ہونے کی حیثیت سے مسلم لیگ اپنا پیش نہاد اور طریق کار قوم کے سامنے رکھتی۔ مرکزی جماعت کی کمی کو صوبائی جماعتوں — بلکہ بالفاظ صحیح تر، افراد — نے پورا کرنے کی سعی ضرور کی ہے۔ لیکن ایک تو ان کی حیثیت قدرتی طور پر مقامی ہے، دوسرے وہ دعاوی بہت بلند بانگ ہیں اور غیر معمولی عمومیت اور حسین ابہام کا پہلو لئے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں عمومی اعتبار سے بھی کچھ کہا گیا ہے: پاکستان کا دفاع ہوگا، کشمیر کا دفاع ہوگا، فساد انتظام دور ہوگا وغیرہ۔ یہ عنوانات خوبصورت ہیں لیکن الفاظ بکمال حسن و رعنائی دشکوہ، حقیر سے حقیر عمل کا بدل نہیں ہو سکتے۔ عوام کی مشکلات حقیقی ہیں اور اقتضات طبعی سے عبارت ہیں۔ خالی جیب و شکم الفاظ سے پر نہیں ہو سکتے، نہ الفاظ سے تن ڈھانپا جا سکتا ہے۔ مسلم لیگ یا اس کے نمائندگان کے مقاصد میں ان مشکلات اور ان کے حل کے عزم کا عدم ذکر اس کی غمازی کرتا ہے کہ قائدین لیگ کو یا تو ان مشکلات مبہمہ کا علم نہیں یا وہ انہیں حل کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے، یا ہر دو سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ ان کا کعبہ مقصود صدارت ہے یا وزارت۔ اور

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اٹھتے نہیں ہیں ہاتھ مرے اس دعا کے بعد

مسلم لیگ نے اپنے نام Good Will سے فائدہ اٹھا کر اپنے انتخابات تو کر لئے، لیکن یہ فائدہ دراصل مسلم لیگ نے نہیں اٹھایا، بلکہ بتائے وقت نے مسلم لیگ کے نام کو اپنی مطلب براری کے لئے استعمال کیا ہے، اور جماعت اور ملت دونوں کو بیوقوف بنایا ہے۔ ناظم مسلم لیگ نے مطلقاً اس امر کی کوشش نہیں کی کہ نئی جماعت ناخواندہ عناصر سے پاک رہے یا شخصی کام جوئیوں کی آماجگاہ نہ بنے۔ مسلم لیگ یقیناً اس کا خمیازہ بھگتے گی۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ وقت تک یہ محسوس نہ ہو کہ اس محاذ پر کتنے تخریبی عناصر جمع ہو گئے ہیں لیکن دشمن کا ایک ہی وار پڑا تو دفاعی خطوں میں بے پناہ شگاف پڑ جائیں گے۔ اس وقت مسلم لیگ پرانے زور میں چلی جا رہی ہے۔ وہ توانائی ایک نہ ایک دن ختم ہو گی۔ اس کے بعد جماعت کو نئی قوت توانائی سے آگے بڑھنا ہوگا، یہ قوت اور توانائی خارج سے نہیں آئے گی بلکہ اندرونی صلاحیت سے اس کا چشمہ پھوٹے گا۔ اس وقت مسلم لیگ میدان مقابلہ میں رہ جائیگی۔

اب تک ارباب حکومت کے انداز سے یہی پتہ چلتا تھا کہ وہ ایک، یعنی مسلم لیگ کے علاوہ کسی دوسری سیاسی پارٹی کے روادار نہیں ہوں گے۔ حال ہی میں وزیر اعظم پاکستان نے مجلس دستور ساز میں اعلان کیا ہے کہ دوسری پارٹیوں کو بھی عام اذن تشکیل حاصل ہے۔ یہ درست ہے کہ مسلم لیگ کی حکومت مملکت کے صحیح تحفظ کے لئے یا اپنی پارٹی کے اقتدار کی برقراری کے لئے دوسری پارٹیوں کی تنظیم و ہمہ گیری پر پابندیاں عائد کر سکتی ہے، لیکن اگر کسی حزب مخالف نے عوام کی مشکلات کے حل کا دم بھرا اور نسبتاً خلوص اور قوت سے عوام کی موافقت میں قدم اٹھایا تو عوام اس حزب کو سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور بہ صمیم قلب اس کے پیچھے ہو لیں گے۔ اس سیلاب اتباع کا بہاؤ ایک دفعہ بدل گیا تو کشتِ لیگ بے آب و گیاہ بن جائے گی۔ احزاب مخالف موقع کی تلاش میں ہیں۔ مواقع کی کمی نہیں۔ مسلم لیگ کے ہاتھوں پٹے ہوئے مہر بہروپ بدل بدل کر آئیں گے۔ ان میں ابھی سے زندگی کے آثار ہویدا ہو رہے ہیں۔ ان کے نئے روپ زیادہ دلکش اور نظر فریب ہوں گے۔ وہ مسلم لیگ سے پورا انتقام لیں گے۔ مسلم لیگ خود بخود اپنی موت کے سامان تیار کر رہی ہے۔ مجلس دستور ساز کی رفتار از حد سست ہے۔ نئے انتخابات دستور کی تدوین بلکہ تنفیذ کے بعد ہوں گے اور ابھی اس کے لئے کافی عرصہ درکار ہے۔ مسلم لیگ حکومت جن غیر معمولی مسائل سے دوچار ہے ارکان مسلم لیگ بوجوہ انھیں کما حقہ حل نہیں کر سکتے۔ وہ عوام کا اعتماد سرعت سے کھو رہے ہیں۔ نئے انتخابات میں ہنوز بہت دیر ہے۔ اس وقت مسلم لیگ حکومت عوام کا رہا سہا اعتماد بھی کھو چکی ہوگی۔ احزاب مخالف کیلئے وہ سنہری موقع ہوگا۔ اس سیاسی نیلام میں جس بے قابو زبان نے بڑھ کر بولی دے دی وہ متاع ملت کا سودا کر لے گا۔

ایسے میں مسلم لیگ کا جو حشر ہوگا، سو ہوگا۔ جماعتیں ابھرتی ہیں اور ختم ہو جاتی ہیں۔ قابل غور سوال یہ ہے کہ اس انتشار میں ملت کا کیا بنے گا؟

ملت کے سامنے دو سوال ہیں۔ اگر مسلم لیگ بایں ترکیب تنہا میدان سیاست کی یکہ تازی رہی تو اس کے ہاتھوں نظام سیاست میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا کیا مداوا ہوگا۔ اور اگر اس کی دیکھا دیکھی ایسے احزاب مخالف میدان مقابلہ میں آ گئے جن کے عزائم مشتبہ ہوئے تو اسے ان کی مضرت سے بچنے کے لئے کیا کرنا ہوگا۔ دونوں صورتوں کی مضرات ظاہر ہیں۔ کیا تدبر و دور اندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ مضرت پہنچ چکنے کے بعد اس کے علاج کی تدبیر سوچی جائے؟ اگر حفظ ما تقدم ضروری ہے تو ملت کو ابھی سے ان نتائج بد سے بچنے کی سبیل سوچنی چاہئے۔ طلوعِ اسلام اس ضمن میں اپنی رائے دے چکا ہے۔ ملت ایک ہمہ گیر "پارٹی" ہے۔ اس کی تقسیم در تقسیم، خواہ کسی بنا پر ہی کیوں نہ کی جائے فساد کا باعث ہوگی۔ ان تباہ کن نتائج سے بچنے کی واحد صورت اقتائے احزاب ہے۔ تعدد احزاب اجتماعی ہلاکت ہے ملت میں کسی پارٹی کی گنجائش نہیں خواہ وہ پارٹی مسلم لیگ ہی کی کیوں نہ ہو۔ جب ایک پارٹی کو گوارا کیا جائے گا تو ہر پارٹی کو گوارا کرنا ہوگا۔ اور اسی کا نام انتشار ہے اور نتیجہ فساد۔

معارف القرآن

(تعارف)

ہمارا دور اس اعتبار سے بڑا خوش بخت ہے کہ اس میں قرآن کی طرف مراجعت (Back to Quran) کا خیال عام ہو رہا ہے۔ اس مبارک و مسعود کوشش میں ہمارے محترم جناب پرویز صاحب کا حصہ بڑا نمایاں ہے انہوں نے فی الحقیقت اپنی زندگی کا ایک ایک فارغ لمحہ قرآن پر غور و فکر اور پھر اس غور و فکر کے نتائج کی اشاعت کے لئے وقف کر رکھا ہے۔ اس باب میں، اُن کے خطبات، مذاکرات، مضامین اور تقاریر کے علاوہ، ان کا مستقل کارنامہ جسے اللہ تعالیٰ یقیناً بقائے دوام عطا کرے گا۔ اُن کی مایۂ ناز تصنیف معارف القرآن ہے۔ اس کتاب نے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے قلب و نگاہ میں صحیح اسلامی انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جسے ہر ایک گھر میں موجود ہونا چاہیئے۔ تاکہ اسے سبقاً سبقاً بطور درس پڑھا اور پڑھایا جائے۔ چونکہ طلوعِ اسلام میں اس کتاب کا ذکر آتا رہتا ہے۔ اس لئے ہمارے پاس اکثر استفسارات آتے رہتے ہیں۔ جن میں اس کتاب کے تفصیلی تعارف کا تقاضا ہوتا ہے۔ ان استفسارات کا فرداً فرداً جواب دینا مشکل ہے اس لئے ہم نے اسے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا تعارف خود اس کتاب ہی سے کرا دیا جائے۔ کتاب کی تین جلدیں اس وقت تک شائع ہو چکی ہیں اور چوتھی جلد: جو تذکار جلیلہ حضور سرورِ کائنات پر مشتمل ہے، پریس میں جا رہی ہے۔ ہر جلد ایک تفصیلی مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ پہلی جلد کے مقدمہ میں کتاب کی ترتیب و مقاصد کا تعارف ہے۔ اور دوسری اور تیسری جلد کے مقدمات میں، ان تحاریک و رحجانات پر تبصرہ جن کے پیشِ نظر آج دنیا کو قرآن کی طرف مراجعت ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ ہم نے التزام کیا ہے کہ قارئین طلوعِ اسلام کے افاضہ شوق کی تسکین کے لئے ان مقدمات کو شائع کر دیا جائے۔ چنانچہ ذیل میں جلد اول کا مقدمہ بمسرت شائع کیا جاتا ہے۔ باقی دو جلدوں کے مقدمات اس کے بعد شائع کئے جائیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب پرویز کو فرصت عطا فرمائے کہ وہ اس عظیم القدر کام کو جلد پایۂ تکمیل تک

جماعت کے کرنے کا تھا، پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں۔ یہ یقیناً قرآن کا عشق ہے جو انہیں اس قدر ہمّت دیئے جا رہا ہے۔ ورنہ ان کی زندگی کی مصروفیتوں کو دیکھ کر فی الواقعہ حیرت ہوتی ہے کہ وہ اس کام کے لئے کہاں سے وقت نکال لیتے ہیں۔ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ

[مدیر۔ طلوعِ اسلام]

خاک ما خیزد کہ سازد آسمانے دیگرے
ذرۂ ناچیز و تعمیرِ بیابانے نگر

کائنات کی ہر شے ایک سلگے بندھے قانون کے ماتحت سرگرم عمل ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے ریت کے ذرّے سے لیکر عظیم الشان کرۂ ارض تک۔ ایک کرۂ ارض کیا اس کرہ سے کئی لاکھ گنا بڑا سورج مع اپنے حیرت انگیز نظام کے۔ اور پھر اس نظامِ شمسی جیسے لاتعداد اور اجرامِ سماوی، سب ایک معینہ قاعدے کے مطابق اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرداں ہیں۔ اگر زمین اپنے راستے سے کبھی ایک انچ بھی اِدھر اُدھر ہٹ جائے۔ اگر سورج اپنی رفتار میں ایک ثانیہ کی بھی تبدیلی پیدا کر لے اگر ہوائیں اپنے رُخ کو طرفۃ العین کے لئے خلافِ ضابطہ بدل لیں۔ اگر پانی اپنی فطرت کے خلاف نشیب کے بجائے فراز کی طرف بہنے لگ جائے۔ غرضیکہ اس محیّر العقول کارگہ عالم کا کوئی ایک پرزہ اپنے نظام سے سرتابی اختیار کر لے۔ تو یہ عظیم الشان سلسلۂ کائنات درہم برہم ہو جائے۔ زندگی اور اس کی تمام رنگینیاں، دنیا اور اس کی جلد نمت آفرینیاں اس بنا پر قائم ہیں کہ فطرت کی ہر شے ایک خاص قانون کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ (سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) اس حیرت خانۂ امروز و فردا کا ایک ایک ذرّہ اپنے دائرۂ عمل میں پوری مستعدی سے اطاعت کوش ہے (وَلِلّٰہِ یَسْجُدُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) ہر شے اس کے قوانین کے سامنے سجدہ ریز ہے (کُلٌّ لَّہٗ قٰنِتُوْنَ)

قانونِ فطرتِ انسانی

جب عالمِ موجودات کی ہر شے کے لئے ایک قانونِ زندگی اور ضابطۂ حیات متعین ہے تو کیا انسان جو اس خطۂ ارض پر سلسلۂ ارتقا کی آخری کڑی اور نظمِ کائنات کا حسین مقطع ہے اس ضبط و آئین سے مستثنیٰ ہوگا؟ ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ نظامِ کائنات کے خلاف ہوگا جب کائنات کی ہر شے ایک خاص نہج و اسلوب کے ماتحت زندگی بسر کر رہی ہے۔ تو انسان کے لئے بھی ضروری ہے کہ ایک خاص ضابطۂ حیات کے مطابق دنیا میں رہے۔ وہ قانونِ حیات جس کے مطابق زندگی بسر کرنا انسان کے لئے تقاضائے فطرت ہے اسلام کہلاتا ہے۔

فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْہَا ؕ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰہِ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ
وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۰ : ۳۰﴾

خدا کا وہ قانونِ فطرت جس کے مطابق اس نے نوعِ انسانی کو پیدا کیا۔ اللہ کے (قانون) خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہی دینِ محکم ہے لیکن اکثر لوگ (اس حقیقت کو) نہیں جانتے

یہ آئین و ضوابط جن کے ماتحت زندگی بسر کرنا تقاضائے فطرت انسانی ہے۔ خدا کی طرف سے بذریعہ وحی انسانوں تک پہنچتے رہے۔ یہ سلسلہ ذہن انسانی کے عہدِ طفولیت سے اس کے مقتضیات کے مطابق بڑھتا ہوا ساتھ چلتا رہا۔ تاآنکہ انسانیت اپنے عہدِ شباب تک آپہنچی۔ یہاں اس سلسلہ کی تمام منتشر کڑیوں کو یکجا کرکے اور فطرت انسانی کے انتہائی مقتضیات کو سامنے رکھ کر بارگاہ ایزدی سے ایک جامع اور مکمل ضابطۂ حیات عطا ہوا جو قیامت تک کیلئے قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ اس لئے اگر آج کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ وہ کونسا قانونِ زندگی اور نظامِ حیات ہے جو فطرت انسانی کے مطابق ہے تو اس کا ایک اور صرف ایک جواب ہے کہ وہ ضابطۂ حیات قرآن کریم ہے۔ دنیا جب اس نظام کے مطابق زندگی بسر کرے گی تو اس اسلوب کا نام جادۂ اعتدال یا صِرَاطِ مُسْتَقِیْم ہوگا۔ اور جب اس کے خلاف چلے گی تو اسے فساد یعنی غیر فطری زندگی کہا جائے گا۔

قانونِ فطرت کی سادگی و پختگی

اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اس لئے اس کی تعلیم ایسی سادہ اور سیدھی دل میں اتر جانے والی اور اس کے مہمات اصول، قوانینِ فطرت کی طرح ایسی محکم اور غیر متبدل بنیادوں پر قائم ہیں کہ انہیں قبول کرنے میں ذہن انسانی کو اور ان پر عمل پیرا ہونے میں قلب جوارح کو فطرت انسانی کے خلاف جنگ نہیں کرنی پڑے گی بلکہ عین فطرت ہونے کی وجہ سے فطرت انسانی اسے اپنا ہم آہنگ پائے گی۔ لیکن جس تعلیم کو اب عام طور پر اسلامی تعلیم کہا جاتا ہے۔ وہ لاینحل مباحث، دور از کار مسائل اور بے نتیجہ رسوم و ظواہر کا ایسا گورکھ دھندا ہے کہ اسے قبول کرنا تو درکنار اس کے سلجھانے کی ہر کوشش اس کے الجھاؤ کو پیچیدہ تر کردیتی ہے۔

دینِ فطرت کی حقیقی روح

دینِ فطرت کی حقیقی روح ہمیں قرنِ اولیٰ میں نظر آتی ہے۔ جب وسائٹی کا تمام نظام فطرت کے حسین و سادہ خطوط پر متشکل ہو چکا تھا اور ہر عملِ صالحہ کا درخشندہ نتیجہ نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ لیکن وہ دورِ عمل، وہ مجاہدانہ خدا پرستی کا زمانہ جلد گزر گیا۔ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوگئی اور رفتہ رفتہ ملوکیت کی تمام ہلاکت آفریں خرابیاں اور عجمی تکلفات اسلامی تمدن پر چھاگئے۔

عجمی اثرات

یوں تو ملوکیت کی ابتدا بنی امیہ کے زمانہ سے ہوگئی تھی۔ لیکن عہدِ عباسیہ میں اسلامی روح پر عجمیت اس درجہ غالب آگئی کہ اس کے نظر فریب و زرنگار نقابوں کے اندر مستور عروسِ حقیقت کا سراغ بمشکل ملتا ہے عباسی دور ہمارے علمی کارناموں کا درخشندہ عہد ہے اس عہد میں یونانی فلسفہ عربی میں منتقل ہوا۔ اسرائیلیات کے افسانے قصص قرآنی بنے، ربط و ضبط، قائم کرنے کے لئے ذیب داستان بنے۔ فرصت کا زمانہ، فراغت کے دن، رفتہ رفتہ سیرت حجازی کی شمشیر و سناں کی ولولہ انگیزیاں عجمی تہذیب کے طاؤس و رباب کی نرم خیزیوں میں تبدیل ہوگئیں نتیجہ یہ کہ ایک طرف تو توائے عملیہ مضمحل ہوگئے اور دوسری طرف اسلام کی نظری تعلیم عجمی تصورات کے پردوں میں چھپ کر فلسفیانہ موشگافیوں اور تعصل و روایات کی توہم پرستیوں کی نذر ہوگئی۔ قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی بعثتِ مقدسہ کا مقصدِ عظیم یہ بتایا ہے وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (۷/۱۵۷) یعنی حضورؐ ان طوق و سلاسل کو

توڑ کر پھینک دیں گے جن کے نیچے انسانیت دبی چلی آتی تھی۔ ان طوق و سلاسل کی نوعیتوں میں کتنا ہی اختلاف اور شکل و صورت میں کیسا ہی تفاوت کیوں نہ ہو، حقیقت کے اعتبار سے ان کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ملوکیت اور برہمنیت یعنی خدا اور بندے کے درمیان دوسری قوتوں کا حائل ہو جانا۔ ملوکیت انسانوں سے اپنی عبودیت چاہتی ہے اور برہمنیت خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بنتی ہے۔ اسلام کی حقیقت کشا تعلیم اور نبی اکرمؐ کے عدیم النظیر عمل نے ان دونوں غیر فطری قوتوں کو یکسر اکھیڑ پھینکا اور یہ طوق و سلاسل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گئے۔

لیکن بعد میں آنے والے مسلمانوں نے ان شکستہ زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو پھر سے اٹھایا اور پہلے سے بھی محکم زنجیریں تیار کر کے خود اپنے ہاتھوں سے آپ پہن لیں اور اس کے بعد مرغِ قفس آشنا کی طرح ان سے ایسے مانوس ہوئے کہ یہی پابہ زنجیر زندگی ان کی نگاہوں میں فطری آزادی کی حسین ترین شکل اختیار کر گئی۔ غور فرمایئے مسلمانوں پر صدیوں سے محکومیت اور برہمنیت کی غیر فطری قوتیں مسلط ہیں اور یہ ان سے اس درجہ خوگر ہو چکا ہے کہ ان کے خلاف اس کی طبیعت کبھی ابا نہیں کرتی۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے ان زنجیروں کی طرح عہد بنی امیہ میں پڑی اور عہد عباسیہ میں یہ محکم و استوار ہوئیں۔

زوالِ بغداد کے بعد صورت حالات بد سے بدتر ہو گئی۔ مرکزیت فنا اور امت ریت کے ذروں کی طرح منتشر ہو گئی۔ ہر زاویہ اور ہر گوشہ، ہر منبر اور ہر خانقاہ جداگانہ مرکز بن گئے۔ اب نہ دلوں میں وہ مجاہدانہ جوش تھا نہ نگاہوں میں قرآنی بصیرت۔ بمشکل اندر مشکل کہ آگے بڑھنے تو ایران کے آتشکدوں کی گرمیٔ نفس اور حرارت سخن نے اس تصوف کو فردوس نگاہ بنا دیا جس کی رو سے دین انفرادی تزکیۂ نفس اور ذاتی نجات کا ذریعہ بن کے رہ گیا اور وہ اجتماعی اور مرکزی زندگی جس کا مقصد اس زمین پر حکومت الٰہیہ کا تخت اجلال بچھانا تھا نگاہوں سے اوجھل ہو گئی اور رفتہ رفتہ رہبانیت کے عناصر ایک ایک کر کے جزو دین بن گئے۔ ان نظر فریب عجمی پردوں میں ملبوس اسلام، جب درۂ خیبر سے آگے بڑھا تو آریہ ورت کی ویدانت نے بہت تپاک سے اس کے ماتھے پر سیندور کا تشقہ لگایا اور اس کے چرنوں میں اپنی شردھا (عقیدت) کے پھول چڑھائے۔ اب یہاں ناقوس و اذان میں ہم آہنگی کی کوششیں شروع ہوئیں۔ تسبیح کے دانے رشتۂ زنار میں پروئے جانے لگے۔ زمزم و گنگ کے امتزاج سے ایک جدید چشمۂ حیات کی تلاش ہونے لگی۔ خاک حجاز اور جمنا جل کے مسالے سے "خدا کے ایک نئے گھر" کی تعمیر سطح خیال سے ابھرنے لگی۔ ہندی رسومات شعائر دین بن گئیں۔ برہمن کا فلسفۂ حیات مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اور رفتہ رفتہ دین حجازی کا یہ بیباک بیڑہ گنگا کے دھانے میں ڈوب گیا۔

تہذیبِ مغرب

ادھر یہ ہو رہا تھا، ادھر یورپ سے الحاد و مادہ پرستی کا بحر مواج، اپنی شورانگیزیوں اور طوفان خیزیوں کے ساتھ امڈتا ہوا آیا جس میں کہیں علانیہ انکار و سرکشی کی کف بر دہان طغیانیاں تھیں اور کہیں عقل پرستی اور تجدد پسندی کی بظاہر ساکت و صامت، لیکن درحقیقت بھیانک اور خوفناک روانیاں۔ خدا، رسول، وحی، آخرت، غرضیکہ ایمان و یقین کی ہر متاع عزیز کو خس و خاشاک کی طرح

اپنے ساتھ بہائے لئے جا رہی تھیں۔ دین فطرت میں تو یہ صلاحیت تھی کہ وہ ایسے طوفان بلا سے بھی زیادہ مہیب و مہیج طغیانیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ لیکن جن ریت کی دیواروں نے دین مبین کے حصار محکم ہونے کا دعوٰی کر رکھا تھا ان میں یہ قوت کہاں تھی کہ وہ اس بلا انگیزی کی روک تھام کر سکتیں۔ نتیجہ یہ کہ نوجوان طبقہ دین سے بیگانہ ہی نہیں متنفر ہو گیا۔ یہ طوفان بڑا خطرناک تھا۔ لیکن حامیان مذہب بالعموم اس بڑھتے ہوئے فتنہ کا سر کچلنے کے لئے فتاوٰی تکفیر و تفسیق کو کافی سمجھا اور یوں اپنی خود فریبی اور عملاً اعتراف شکست کا ثبوت بہم پہنچایا۔

ماضی پرستی

مذہب پرست طبقہ کی سب سے بڑی کمزوری اس کی ماضی پرستی ہے جو انہیں اپنے تصورات کے تنگ دائرہ سے باہر قدم نہیں رکھنے دیتی۔ ماضی سے وابستگی ایک گراں مایہ جوہر ہے۔ ہم اپنے اسلاف کے کارناموں کے وارث ہیں اس لئے اس منابع حیات سے مستفید ہونا ہمارے لئے قابل فخر ہے۔ لیکن ماضی پرستی اس سے الگ چیز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ پہلے سمجھا گیا اس سے زیادہ اب سمجھا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ پہلے کہا گیا اس پر ایک حرف کا اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اس ماضی پرستی کا عملی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم جیسی ہمیشہ زندہ رہنے والی کتاب کو ایک خاص ماحول کا پابند بنا دیا جاتا ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ قرآن کریم خدا کا آخری پیغام ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب عظیم قیامت تک کے آنے والے انسانوں کے لئے ضابطہ حیات اور نصاب زندگی ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی زندگی سے متعلق آئے دن نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ان مسائل کا حل بھی قرآن کریم کے اندر موجود ہے۔ ان مسلمات کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کسی خاص ماحول سے وابستہ نہیں ہو سکتا۔ اگر قرآن کریم کو کسی خاص زمانہ میں مقید کر دیا جائے تو عصر حاضر یا اس کے بعد کے آنے والے انسان اپنے مسائل حیات کا حل اس سے کیسے دریافت کر سکتے ہیں؟ اس نظریہ کے ماتحت قرآن کریم میں تفکر و تدبر کا دروازہ بالکل بند ہو جاتا ہے۔ اور ذہن انسانی رفتہ رفتہ جمود و تعطل اور کورانہ تقلید و ماضی پرستی کی برفانی سلوں سے مفلوج اور شل ہو کر رہ جاتا ہے۔

قرآنی ہدایت

قرآن کریم جس طرح کسی خاص قوم یا جماعت کی ہدایت کے لئے نہیں بلکہ نسلی، لسانی، طبقاتی، وطنی، قبائلی۔ غرضیکہ تمام غیر فطری حدود و قیود کو توڑ کر تمام دنیا کے انسانوں کے لئے یکساں طور پر آئین حیات ہے۔ اسی طرح یہ صحیفۂ فطرت زمانی قیود سے بھی ناآشنا ہے۔ یعنی جس طرح فطرت کی کوئی شے ایسی نہیں جو کسی زمانہ میں بھی یہ کہہ دے کہ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتی۔ اسی طرح قرآن کریم بھی یہ کبھی نہیں کہے گا کہ بس اب میں تھک گیا ہوں۔ اب کسی اور راہبر کی تلاش کرو۔ قرآن کریم کی آیات کو ہر زمانہ کے مسائل حیات کے حل کے لئے کھوتے جائیے۔ جہاں اندر جہاں۔ زمانہ در زمانہ۔ ان کے پیچ و خم میں لپٹا ملے گا۔ فطرت کی کسی چیز کو لیجئے۔ مثلاً پانی کے متعلق ابتدائی زمانہ کا انسان اتنا ہی جانتا تھا کہ اس سے پیاس بجھائی جا سکتی ہے۔ لیکن پانی کے اندر چھپی ہوئی خصوصیتیں زمانہ کی عقل و علم۔ تجربہ و شناخت کے ساتھ ساتھ یوں کھلتی گئیں گویا وہ اس کی لہروں کے پیچ میں لپٹی ہوئی تھیں۔ آج پانی سے جس قدر کام لئے جاتے ہیں ابتدائی زمانہ میں بھی یہ خصوصیتیں اس کے اندر موجود تھیں۔ اور آج بھی نہیں کہا جا سکتا کہ پانی کے اندر جس قدر قوتیں خوابیدہ ہیں سب کی سب بیدار ہو چکی ہیں۔ اسی فضا کو دیکھئے جو کل تک خالی سمجھی جاتی تھی۔ آج اس میں انسان کی انگلیوں نے ایک نئی دنیا

آباد کر دی تھیں۔ ایتھر کی امواج تو پہلے بھی موجود تھیں۔ اسی خلا میں آسودہ اس انتظار میں تھیں کہ انسانی علم و دانش کی سطح بلند ہوتے ہوتے انہیں چھوئے اور وہ اپنی چھپی ہوئی قوتوں کے خزانوں کی چابیاں اس کے حوالے کر دیں۔ قرآن کریم بھی کتاب فطرت ہے۔ اس کا بھی یہی عالم ہے۔ زمانہ علم و عقل کی جن بلندیوں تک چاہے اڑتا چلا جائے۔ یہ ہر مقام اور ہر بلندی پر انسانی رشد و ہدایت کا سامان اپنے اندر رکھتا ہے کہ یہ اس خدا کی طرف سے پیغام ہدایت ہے جس کی نگاہوں سے کوئی حقیقت پوشیدہ اور جس کے علم سے کوئی شے باہر نہیں۔ اسے خوب معلوم ہے کہ انسان کی فطرت کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا کیا ہیں۔ انسانی زندگی کے سامنے کیا کیا مشکلات پیش آئیں گی اور ان کا فطری حل کیا ہوگا۔ اس لئے قرآن کریم کو کسی خاص زمانہ سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قیامت تک کے لئے نوعِ انسانی کا نصاب زندگی ہے۔ لہٰذا ہمارے تجدد پسند مغرب زدہ طبقہ کا یہ خیال کہ یہ چودہ سو برس کے پُرانے نظریات حیات اس علم و عقل کے زمانہ میں کس طرح ضابطۂ زندگی بن سکتے ہیں۔ قرآن کریم کی حقیقت سے بے خبری پر مبنی ہیں۔ قرآن کریم نہ چودہ سو سال کا پرانا ہے اور نہ صرف اسی زمانہ کے لئے تھا۔ یہ ہر وقت نیا ہے۔ ہر زمانہ کی چشم دانش و نگاہ بصیرت کے لئے روشنی ہے اور قیامت تک کے لئے اس میں تدبر و تفکر کے دروازے کھلے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں تدبر کے یہ معنی نہیں کہ انسان اسے اپنے ذہن کے تابع کرے۔ یعنی پہلے اپنے ذہن میں کچھ خیالات راسخ کرے۔ پھر قرآن کریم کو ان کے قالب میں ڈھالنا شروع کر دے۔ یہ تو کھلا ہوا الحاد ہے۔ قرآن کریم کے حقائق محکم اور اٹل ہیں۔ وہ انسانی امیال و عواطف اور رجحانات و جذبات کے تابع نہیں ہو سکتے۔ مومن وہ ہے جو اپنے تمام رجحانات قلبی و ذہنی کو خدا کی اس کتاب مقدس کے تابع رکھے۔

قرآن فہمی

اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن کریم کو کسی خاص زمانہ کے ساتھ مقید نہیں کیا جا سکتا اور کوئی شخص اسے اپنے تابع بھی نہیں رکھ سکتا تو پھر اسے سمجھا کیسے جا سکتا ہے؟ قرآن کریم کی رو سے اس کا جواب کچھ مشکل نہیں۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنی تفسیر آپ کرتا ہے اور اس تفسیر میں وہ کسی خارجی روشنی کا محتاج نہیں وہ علم خداوندی کا نور مبین ہے۔ اور نور کو کسی انسانی چراغ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جس خدا نے اسے نازل کیا ہے اس نے اس کی تفسیر بھی خود اپنے ذمے لی ہے۔ ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۷۵/۱۹) قرآن کی تفسیر ہمارے ہی ذمہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس خالق فطرت نے کلی کو پیدا کیا ہے وہی اسے کھلا کر پھول بنا سکتا ہے۔ دنیا کی تمام قوتیں جمع ہو کر کوشش کریں کہ کلی کو مسل کر پھول بنا دیں تو نہیں بنا سکیں گی اس کی پتیاں بکھر جائیں گی پھول نہیں بنیں گی کہ اس طرح غنچے کی شگفتگی خود خالق فطرت کا کام ہے، قرآن کی تبیین و تفسیر بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے۔ اس کی ہر بات خود اس کی مدد سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ البتہ اس کے سمجھنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔

قرآن کریم کے مضامین جس انداز و طریق سے بیان کئے گئے ہیں اور ان کی ترتیب میں جو حسن اسلوب اور نظم و ربط ہے۔ اس سے بہتر تو کجا۔ اس جیسا اسلوب و انداز انسان کے حیطۂ امکان میں نہیں۔ لیکن قرآن کا انداز ترتیب دیوانِ انسانی تصنیفات سے الگ ہے۔ وہ ایک مضمون کو مسلسل ایک ہی مقام پر بیان نہیں کرتا۔ ایک جگہ ایک حکم مذکور ہے۔ دوسری جگہ اس پر اضافہ ہے۔ کہیں استثناء ہے کہیں اجمال ہے کہیں اس کی تفصیل ہے۔ اس انداز بیان کا نام

قرآن کریم کی اصطلاح میں "تصریف آیات" (یعنی آیات کا پھیر پھیر کر لانا ہے)، اور اس سے غرض قرآن کی تفسیر کرنا سمجھانا ہے۔ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ۝ (۶/۶۵) دیکھو ہم کس طرح آیات کو پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں تاکہ وہ بات سمجھ لیں۔ دوسری جگہ ہے کہ ہم تصریف آیات اس لئے کرتے ہیں لِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ (۹/۶)، تاکہ سمجھنے والوں کے لئے ہم اسے (قرآن کو) واضح کر دیں۔ غور فرمائیے۔ اوپر سورۂ قیامہ کی آیت (۷۵/۱۹) میں ارشاد تھا کہ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (قرآن کی تبیین "بیان" ہمارے ذمہ ہے۔ اور یہاں (سورۂ انعام) میں فرمادیا کہ یہ تبیین (لِنُبَيِّنَهٗ) تصریف آیات سے کی جاتی ہے۔ سو قرآن کریم نے خود واضح کر دیا کہ تصریف آیات سے قرآن اپنی تفسیر آپ کر دیتا ہے۔ اس کی تفصیل معارف القرآن کی کسی آئندہ جلد میں قرآن کے عنوان کے ماتحت ملے گی۔ اس حقیقت کے پیش نظر قرآن کریم کے مطالب کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مسئلہ زیر نظر سے متعلق تمام مباحث و مقامات (آیات متعلقہ) بیک وقت نگاہوں کے سامنے آجائیں۔ لیکن اس کے لئے قرآن کریم پر بڑے عبور کی ضرورت ہے اور اس باب میں بالعموم ہماری جو حالت ہے وہ ظاہر ہے۔ نوجوان طبقہ میں قرآن کریم کی طرف جو تھوڑا بہت رجحان پیدا ہو رہا ہے وہ بھی غنیمت ہے۔ ان میں ایک ایسی پیاس کے آثار نظر آرہے ہیں جسے وہ کتاب حکیم کے چشمۂ حیات سے سیراب کرنا چاہتے ہیں لیکن ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قرآن کریم کو سمجھنے کے لئے اس پر ایسا عبور حاصل کر لیں گے جس کا اوپر کیا جا چکا ہے امید موہوم ہے۔

یہ وہ دقت تھی جو ایک عرصہ سے میرے سامنے آرہی تھی۔ سعادت مند نوجوانوں کے دل میں قرآن کا شوق پیدا ہوتا، وہ مجھ سے پوچھتے کہ ہم قرآن کو کس طرح سمجھیں۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا تھا کہ قرآن کو پڑھو۔ یہ پڑھنے ہی سے سمجھ میں آئے گا۔ لیکن جب وہ کہتے کہ ہم نے تو اسے کئی بار پڑھا ہے لیکن نہ صرف یہ کہ وہ سمجھ میں نہیں آتا۔ بلکہ اس کے اندر ہمیں کوئی لذت و جاذبیت محسوس نہیں ہوتی تو اس سوال کے جواب میں ایک حقارت آمیز "لاحول" سے کام نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے کہ مستفسرین کے صحیح ذوق کی تڑپ اور جذبۂ صادقہ میں میرے لئے شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ میں نے اس مشکل کی صحیح وجہ اور اس کا حل معلوم کرنے میں غور کیا۔ اور ہر بار اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ چاہتے یہ ہیں کہ مختلف مباحث و مسائل بیک نظر اُن کے سامنے آجائیں۔ اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کے سامنے قرآن کریم اس شکل میں پیش کیا جائے کہ اس کے سمجھنے میں تردد و کاوش نہ ہو، یعنی جو بات قرآن کریم پر از خود عبور حاصل ہونے کے بعد حاصل ہونی چاہیئے وہ انہیں خود تیار کر کے دیدی جائے۔ اور ہر مسئلہ کے متعلق قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم کو اس طرح یک جا جمع کیا جائے کہ وہ ایک مربوط و مسلسل مضمون کی صورت اختیار کر لے۔ یہ چیز ہماری مروجہ تفاسیر میں نہیں مل سکتی اس لئے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ایک آیت کا الگ الگ مطلب بیان کرتی جاتی ہیں۔ جس سے آیات کا مطلب سمجھ میں آجائے تو آجائے لیکن قرآن کریم کی پوری تعلیم سمجھ میں نہیں آسکتی۔ تبویب القرآن پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سے بھی یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ان میں بالعموم آیات کو الفاظ کے اعتبار سے یکجا کیا گیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے نہیں۔ اگر کہیں موضوع کا بھی خیال رکھا گیا ہے تو آیات کو ایک مربوط مضمون کی صورت میں پیش نہیں کیا گیا۔

ان حالات میں قرآن کریم کی تعلیم کو مذکورہ صدر نہج پر مرتب کرنا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ایسے کام درحقیقت جماعتوں کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے موجودہ دور انفرادیت میں جبکہ جماعتی نظام کا تصور ہی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے امید کہ کوئی جماعت اس مقصد کے لئے تیار ہو جائے گی موہوم تھی۔ میں نے کوشش بھی کی کہ کوئی جماعت اس کے لئے آمادۂ عمل ہو جائے لیکن ناکام رہا۔ اب میرے لئے سوائے اس کے چارہ کار نہ تھا کہ میں اس عظیم الشان کام کیلئے خود ہی قدم اٹھاؤں۔ چنانچہ جو نقشہ میرے سامنے تھا اس کے مطابق میں نے بتجربۃً دو تین عنوانات کو لیا۔ ابتداء میں کچھ دقت ضرور ہوئی لیکن جب اس کے نتائج میرے سامنے آئے تو میری نگاہوں میں چمک پیدا ہو گئی۔ اہل طلب کا تقاضا۔ دوسری طرف اس تجرباتی کوشش کے درخشندہ نتائج۔ اب میرا خیال یقین کی حد تک پہنچ گیا کہ یہ کام کرنے کا ہے۔ کام کی عظمت اور اپنی کمزوریاں حوصلہ شکن تھیں۔ لیکن وقت کی ضرورت اور نتائج کی اہمیت جرأت آفریں، بالآخر تائید غیبی نے مجھے اس صبر آزما اور عظیم المرتبت مہم کے لئے آمادہ کر دیا۔ اور اس کے بعد میں نے اس فریضۂ مقدس کو مقصد زندگی قرار دے کر اپنی فرصت کا ایک ایک لمحہ اس "جنون" کی نذر کر دیا۔ چنانچہ بارہ برس ہونے کو آئے یہ مرحلۂ شوق مسلسل طے ہو رہا ہے۔ سینکڑوں ابواب تجویز کئے گئے۔ ہر باب کے ماتحت سینکڑوں عنوانات قائم ہوئے۔ ہر عنوان سے متعلقہ سینکڑوں آیات قرآنی بچائی گئیں۔ یہ کام ہو چکا تو اس منزل کا آخری مرحلہ شروع ہوا۔ اور ہر عنوان کے ماتحت جمع شدہ آیات میں ایک خاص ربط معنوی قائم کر کے انہیں مسلسل اور مربوط مضامین کی شکل میں ترتیب دینا شروع کیا۔ اس سے قرآن کریم کا ایک ایسا دائرۃ المعارف وانسائیکلوپیڈیا مرتب ہو گیا ہے جس میں حقائق قرآنی سے متعلق تمام وکمال تعلیم۔ ایک ایک عنوان کے ماتحت ایک ایسے مسلسل اور دلکش مضمون کی صورت میں سامنے آجاتی ہے جس میں قرآن کی تفسیر خود قرآن سے ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس جلیل القدر عمارت کا پورا مسالہ تیار ہے اور اس کا ایک گوشہ یا یوں کہئے کہ منزل اولیں تعمیر ہو کر آپ کے سامنے ہے۔ میں اس مرحلۂ شوق و جنوں کی قطع شدہ منزل پر جب نگاہ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یا اللہ! یہ مسافت میں نے کس طرح طے کر لی؟ حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ کی توفیق اور اس کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو شاید کئی عمروں میں بھی مجھ سے اتنا کام نہ ہو سکتا وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ اس مقام پر جہاں میری جبین نیاز بارگاہ ایزدی میں اظہار تشکر و امتنان کے لئے زمین بوس ہے۔ وہاں میرے قلب کی انتہائی گہرائیوں میں دو ہستیوں کے لئے جذبات سپاس گذاری رقصاں ہیں ایک حکیم الامۃ حضرت علامہ اقبال علیہ الرحمۃ جن کی نگہ حقیقت بین و بصیرت افروز نے اس وادیٔ شوق میں میرے لئے چراغ راہ بنی۔ اور دوسرے شفیق محترم علامہ محمد اسلم جیراج پوری مدظلہ العالی۔ جن کی رفاقت و شفقت صعوبات سفر میں حوصلہ بخش و ہمت افزا ہوئی۔ اللہ تعالےٰ اول الذکر کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ثانی الذکر کو خدمت قرآن کریم کے لئے تا دیر سلامت رکھے۔

یارب ایں آرزوئے من چہ خوش است

میں ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ معارف القرآن یا اس نہج کی کوئی اور کتاب قرآن کریم

کا بدل نہیں ہو سکتی۔ قرآن اپنے الفاظ، آیات بلکہ سورتوں تک کی ترتیب میں قرآن ہے۔ کسی انسان کو حق حاصل نہیں ہے کہ اس کی ترتیب میں کسی قسم کا رد و بدل کر سکے۔ اس لئے مضامین کے اعتبار سے آیات قرآنی کی ترتیب تدوین قرآن کریم کے سمجھنے میں سہولت پیدا کرنے کے لئے ہے۔ جس طرح ترجمۂ قرآن، قرآن سمجھنے کے لئے مفید ہوتا ہے۔ نہ ترجمہ متن کتاب کا بدل ہو سکتا ہے۔ نہ آیات کی مضامین کے اعتبار سے ترتیب۔ ترتیب قرآن کا بدل ہو سکتی ہے۔ یہ تو محض قرآن کریم کے سمجھنے اور سمجھانے کے مختلف اسالیب ہیں۔

تفسیرِ قرآن کسی ایک فرد کا کام نہیں

قرآن کریم ضابطۂ حیات ہے، تاریخ اور جغرافیہ فلسفہ اور ہیئت طبیعیات اور حیاتیات، فلکیات، اور طبقات الارض کی کتاب نہیں۔ لیکن چونکہ یہ اس کی کتاب ہے جس کا علم تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے قرآن کریم میں ضمناً اور طبعاً جہاں جہاں متفرق علوم و فنون کا ذکر آگیا ہے ان اجمالی اشارات میں ان علوم کی اصولی تفصیلات سمٹ کر آگئی ہیں۔ شلاً وجود باری تعالیٰ یا حیات اُخروی کے دلائل میں تخلیق ارض و سموٰت کا ذکر آگیا ہے تو ہر چند یہ تذکرہ ایک ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن ہو نہیں سکتا کہ سائنس کے انکشافات تخلیق ارض و سما کے متعلق اپنی تحقیقات کے بعد جس نتیجہ پر پہنچیں وہ اس سے مختلف ہو جو قرآن کریم میں ضمناً مذکور ہے۔ اگر ان دونوں میں اختلاف ہے تو سمجھ لیجئے کہ ہنوز سائنس کی تحقیق یقین کے مرتبہ تک نہیں پہنچی ظن و قیاس کی حدود کے اندر ہے۔ اس اعتبار سے قرآن کریم جو اوّلاً اور اصولاً حیات انسانی کی ہدایت کا ضابطہ ہے، مختلف علوم و فنون کا مجموعہ بھی بن گیا ہے۔ لہٰذا قرآن کریم کے ان گوشوں کی تفسیر جو مختلف علوم و فنون سے متعلق ہیں کسی ایک شخص کا کام نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم کی رو سے ان مقامات کے معانی تو متعین ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان معانی کی تفصیلات و جزئیات وہی سمجھ سکتے ہیں جو ان علوم کے ماہر ہوں اور جو بتا سکیں کہ ذہن انسانی نے اس وقت تک اس خاص فن میں کہاں تک رسائی حاصل کی ہے۔ اور قرآن کریم اس سے بھی آگے کہاں تک لیجاتا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں ہر ایک شعبہ کے لئے الگ الگ ماہرین کی ضرورت ہے جو قرآن کی روشنی میں ان علوم کی ریسرچ و تحقیق، اور اس کے نتائج سے قرآن کریم کے اجمالی اشارات کی تشریح کریں بعض اہل ذوق حضرات نے اس قسم کی کوشش بھی کی ہے۔ لیکن یہ کام انفرادی کوششوں کا نہیں۔ حکومت یا نظام جماعتی کا کام ہے۔ ماہرین فنون کی جماعتیں قرآن کریم کی ایک ایک آیت کو لیکر اس پر عمریں صرف کر دیں اور اپنی تحقیقات کے نتائج آنے والوں کے لئے منتقل کرتی چلی جائیں۔ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم کی متشابہ آیات، محکمات کی رو میں آتی جائیں اور انسان علیٰ وجہ البصیرت پکار اٹھے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ ظاہر ہے کہ ان مقامات کی تشریح میرے بس کی بات نہیں ہے۔ ان مقامات پر میں زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکا ہوں کہ ان خاص علوم کے اصول و مبادیات کو قرآنی روشنی میں بیان کر دوں تاکہ اس سے ذہن میں ایک اجمالی سا تصور مرتسم ہو جائے کہ قرآن کریم اس خاص شعبہ میں کیا اصول بیان کرتا ہے۔ یہ مقامات ضمنی امور سے متعلق ہیں لیکن قرآن کریم کا وہ حصہ جو نفس انسانی کی ہدایت سے متعلق ہے اور جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کا دستور اساسی ہے اس کی واضح تفسیر آپ کے سامنے آجائے گی ۔۔

میں نے اس چیز کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے کہ آج کل ہمارے مغرب زدہ نوجوان طبقہ کے دلوں میں جس قسم کے شکوک و شبہات علم طور پر پیدا ہوتے ہیں ان کا ازالہ بھی ساتھ ہی ساتھ ہو جائے۔ اس غرض کے لئے مجھے تمہیدی اور توضیحی عبارات بڑھانی پڑی ہیں۔ لیکن عمود ان کا بھی قرآن کریم ہی کی تعلیم ہے۔

ترتیب کتاب انسائیکلوپیڈیا (دائرۃ المعارف) کی ترتیب بالعموم حروفِ تہجی کے اعتبار سے کی جاتی ہے لیکن میں نے معارف القرآن میں اس ترتیب کی بجائے اُس ترتیب کو ترجیح دی ہے، جو قرآنی تعلیم کی خصوصیت ہے۔ قرآن کریم تمام عقائد و اعمال۔ یعنی نظریاتِ زندگی اور ان کی عملی تشکیل ایمان باللہ کی محکم بنیاد پر قائم کرتا ہے۔ اس ایمان و عمل کی تفصیل کے لئے پیغام رشد و ہدایت حضرات انبیاء کرام کی وساطت سے انسانوں تک پہنچتے رہے۔ ان پیغامات کی روشنی میں انسانی زندگی کی (انفرادی و اجتماعی) تشکیل ہوتی رہی۔ اب اُن کا آخری اور مکمل مجموعہ قرآن کریم ہے۔ جو انسان کو اس کی فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنا سکھاتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ کس طرح اس کی کوششیں صحیح نتائج پیدا کرسکتی ہیں۔ اس تمام سعی و عمل کے بعد ایک دوسری زندگی شروع ہوتی ہے جسے حیاتِ اخروی کہا جاتا ہے۔ یہ ہے ایک سرسری سا خاکہ قرآنی تعلیم کی ترتیب کا۔ معارف القرآن میں بھی اسی ترتیب کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ اور مختلف مجلدات کے عنوانات بھی یہی تجویز کئے گئے ہیں۔ ان کی تفصیل ملاحظہ فرمایئے۔

(۱) **اللہ** ایمان باللہ کا مفہوم۔ صفاتِ باری تعالےٰ کی تفصیل۔ اس ایمان کا حیاتِ انسانی پر اثر۔

(۲) **رسالت** (معہ ملائکہ) وحی کی حقیقت۔ حاملین پیغامات خداوندی (علیہم السلام) کا تذکرۂ جمیل۔ حضورؐ کی بعثتِ مقدسہ کا مقصدِ عظیم[1]

(۳) **کتب** پیغامات خداوندی کے قرآنی تذکرے۔ اس سلسلۂ ورماز کی ابتداء و انتہا۔

(۴) **کائنات** انسان اور اس سے متعلقات کی تفصیلی بحث

(۵) **آخرت** حیاتِ اخروی۔ مکافاتِ عمل۔ جنت و جہنم

کائنات کے عنوان میں چونکہ پورا اسلامی نظام۔ قرآنی تعلیم۔ دنیا کے مختلف نظریاتِ زندگی۔ اخلاقی معاشرتی۔ معاشی۔ تمدنی۔ عمرانی۔ اقتصادی۔ نفسیاتی، اجتماعی، مباحث۔ مختلف علوم و فنون (مثل تاریخ و جغرافیہ۔ اثری تحقیقات۔

---

[1] ابتداءً یہی خیال تھا کہ دوسری جلد میں رسالت اور تیسری میں کتاب کے عنوانات مکمل ہو جائیں گے۔ لیکن اصل ترتیب کے وقت دیکھا گیا کہ جلد دوم میں رسالت سے متعلق صرف اصولی بحث ہوسکی ہے (جس کی تفصیل جلد دوم کے مقدمہ میں ملے گی) اور تیسری جلد میں حضرات انبیاء کرام کی تاریخ ہے۔ اس لئے رسالت اور کتاب کے دونوں عنوانوں کو یکجا کر دیا گیا۔ اب یہ عنوان جلد چہارم میں سیرۃ طیبہ حضور ختم المرسلین کے ساتھ تکمیل پذیر ہوگا۔ اور جلد پنجم میں کائنات کا عنوان لے گا۔ انشاءاللہ

علم الارض و فلکیات، شعائر و مناسک، رسوم و مظاہر، قوانین ملی و ساتیر بین الاقوامی غرضکہ علم و عمل کے مختلف شعبے اور متنوع گوشے آجائیں گے اس لئے یہ عنوان غالباً دو جلدوں میں سمٹ سکے گا۔ اس اعتبار سے ظن غالب ہے کہ یہ مجموعہ چھ جلدوں میں مکمل ہوگا (الشارات العزیز) جس میں سے جلد اول آپ کے سامنے ہے۔ آخری جلد کے ساتھ (یا الگ) ایک جامع اشاریہ (انڈکس) ہوگا۔ اس انداز کا کہ تعلیم قرآنی سے متعلق کوئی خیال آپ کے ذہن میں آئے اس انڈکس سے معلوم ہو جائے کہ معارف القرآن میں کس مقام پر اس کی تفصیل ملے گی۔ آیات کا مکمل انڈکس الگ ہوگا۔ جس سے بیک نظر معلوم ہو جائے گا کہ فلاں آیت کس کس مقام پر آئی ہے۔

ربط و نظم

قرآن کریم کی دعوت کی بنیاد وحدت خالق اور وحدت مخلوق کے اصول پر مبنی ہے۔ انسان کو اپنے عہد طفولیت میں کائنات کی ہر شے الگ الگ نظر آتی تھی۔ وہ خاک کے ذرے اور آسمان کے ستارے میں کوئی باہمی ربط محسوس نہیں کرتا تھا اس لئے وہ مختلف قوتوں کے حامل، مختلف خداؤں کے وجود کا قائل تھا۔ لیکن انسانی علم و عقل، تجارب و مشاہدات نے آہستہ آہستہ قرآن کریم کے اس دعوے کی تصدیق شروع کر دی ہے کہ کائنات کی ہر شے کی اصل ایک ہے اور ان میں بہت گہرا ربط و ضبط ہے کہ ؎

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

اس لئے آج حقیقت تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ خواہ ایک ذرہ کو لے کر بیٹھیں پورے کا پورا نظام عالم آپ کے سامنے ہو۔ جب آپ اس انداز سے ایک ذرہ کی ماہیت دریافت کرنا چاہیں گے تو اس کے اندر فی الواقعہ پوری کائنات پوشیدہ نظر آئے گی۔ قرآن کریم کی تعلیم کا بھی یہی عالم ہے۔ ظاہر بین نگاہوں کو نہ اس کی آیات میں باہمگر ربط نظر آتا ہے نہ اس کی سورتوں میں کوئی نظم۔ لیکن جب قرآنی تعلیم کا پورا نظام سامنے ہو تو پھر ایک ایک لفظ کے اندر باہمی ربط و ضبط نظر آجاتا ہے۔ اور ایک مختصر سے عنوان سے پوری تعلیم کا خاکہ نگاہوں کے سامنے موجود ہوتا ہے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کا نظام تعلیم کس قدر معجزانہ ہے۔ جب ایک مرتبہ اس کا اصولی خاکہ ذہن میں آجائے تو اس کے بعد اس کے چھوٹے سے چھوٹے ٹکڑے میں پوری کی پوری تعلیم یوں مرتسم نظر آتی ہے جیسے شبنم کے شفاف قطرہ میں آفتاب جہانتاب اپنے پورے جلال کے ساتھ جھلمل جھلمل کر رہا ہو۔ یا جیسے چاند کی ایک ہلکی سی کرن میں اس کی پوری تابانیاں سمٹ کر آ بیٹھی ہوں۔ معارف القرآن کی جلد اول کا عنوان اگرچہ اللہ ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی صفات سے متعلق ہی مختلف مباحث آئے ہیں۔ لیکن اس جلد میں سے کوئی ایک باب اور اس باب کا کوئی عنوان سامنے لے آئیے آپ دیکھیں گے کہ اسلامی تعلیم کا نظام ہر جگہ سامنے ہوگا۔ ایسا ہی ہر جلد اور اس کے ہر باب میں ہوگا۔ ایک دفعہ اسلامی تعلیم سمجھ میں آجائے۔ پھر دیکھئے گا کہ قرآن کریم کے ہر جزو میں کل منعکس ہے۔ شہد کا ہر قطرہ شہد ہے۔ نور کی ہر کرن نور ہے۔ پس نظام قرآنی کو سمجھنے کے لئے ایک مرتبہ معارف القرآن کا مسلسل مطالعہ کیجئے۔ اس کے بعد جس عنوان کو جی چاہے دیکھئے پوری بات سمجھ میں آجائے گی۔

[اس کے بعد کتاب کی ترتیب کے متعلق کچھ تفاصیل ہیں جو کتاب کے مطالعہ کے وقت ہی کام آمد ہو سکتی ہیں۔ اس لئے انہیں یہاں سے حذف کر دیا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام]

اعتراف

جیسا کہ شروع میں لکھا گیا ہے۔ میری کوشش تمام تر یہ ہے کہ قرآن کے مباحث و مقاصد عالیہ کو اس انداز میں پیش کر دوں کہ ہر مسئلہ اور ہر مقصد سے متعلق قرآن کریم کے تمام گوشے بیک نظر آپ کے سامنے آجائیں۔ اور میں نے امکان بھر جد و جہد کی ہے کہ کوئی باب تشنۂ تکمیل نہ رہ جائے اور اس میں کوئی شے غیر قرآنی داخل نہ پانے۔ لیکن بایں ہمہ احتیاط و کوشش۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ انسانی دماغ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ جو کسی صورت میں بھی سہو و خطا سے منزہ نہیں ہو سکتا۔ میں ایک عرصہ سے مختلف مباحث پر کچھ نہ کچھ لکھتا چلا آرہا ہوں۔ لیکن یقین مانئے کہ قرآن کریم کے متعلق ایک لفظ لکھتے وقت بھی میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ ہاتھ تھر تھرا جاتا ہے کہ یہ ذمہ داری بہت بڑی اور یہ مرحلہ نہایت نازک ہے۔ انسان جوں جوں قرآن کے قریب ہوتا ہے اس کی عظمت اور اپنی کوتاہیاں نمایاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس لئے مجھے یہ دعویٰ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جو کچھ سمجھا گیا ہے وہ لفظ آخر ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں ترمیم و اصلاح کی گنجائش نہیں۔ نہ ہی اس سے یہ مقصود ہے کہ قرآن کریم کی تمام و کمال تعلیم استیعاباً معارف القرآن کے اندر آگئی ہے۔ اتنی کوشش اور محنت کے باوجود سینکڑوں عنوانات ایسے ہو سکتے ہیں جن کا اس پر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کریم تو ایک ایسا بحرِ بے کنار ہے کہ کوئی انسانی عقل اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ میں نے جو کچھ کیا ہے وہ فقط ایک خاکہ ہے اس حقیقت کے سمجھانے کا کہ قرآن کریم کی صحیح تعلیم یوں سمجھ میں آسکتی ہے۔ دنیا آگے بڑھے گی اور اس خاکہ میں رنگ بھرے گی۔ زمانہ ترقی کرے گا اور ان بنیادوں پر فلک بوس عمارت تعمیر کرے گا۔ میرا منشا تو اتنا ہی ہے کہ وہ سعید روحیں جو قرآنی حقائق کی تڑپ رکھتی ہیں اُن کے لئے ابتدائی مشکلات حل کر دوں جو قرآن کریم کو براہِ راست سمجھنے میں ان کے راستے میں حائل ہوتی ہیں۔ میرے پیشِ نظر قرآن سے تعارف کرانا ہے۔ اس کے بعد قرآن کریم میں وہ خود کشش و جاذبیت ہے کہ انسان اسے کسی قیمت پر بھی چھوڑ نہیں سکتا۔ میں کیا عرض کروں کہ قرآن میں کیا لذت ہے ؎

ذوق ایں بادہ ندانی بخدا تا نچشی

دنیا کا کوئی اور سرور اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مقابلہ تو ایک طرف سمجھانے کے لئے ٹھیک ٹھیک تشبیہ نہیں دی جا سکتی۔ جس طرح شبنم کے بعد ہر شے اس میں بھیگی معلوم ہوتی ہے۔ سورج نکلنے کے بعد ہر چراغ ماند پڑ جاتا ہے۔ قرآن سامنے آجانے کے بعد ذہنِ انسانی کا بلند سے بلند شاہکار کھلونا بن کے رہ جاتا ہے۔ جوں جوں اس کے حقائق بے نقاب ہوتے جاتے ہیں انسان وجد و مسرت سے مستقیم انقلاب ہے۔ ہر شے کی صحیح قدر و قیمت سامنے آجاتی ہے۔ اس کی نگاہ کا زاویہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز بدل جاتی ہے۔

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود

میں اپنی اس لذت میں آپ کو بھی شریک کرنا چاہتا ہوں کہ تکمیل مسرت دوسروں کی شرکت سے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر میری یہ حقیری کوشش کسی ایک سعید روح کے لئے بھی قرآن فہمی کے ذوق کا موجب بن گئی۔ تو میں سمجھوں گا کہ میری کاوشوں کا مجھے کافی صلہ مل گیا۔ اصل صلہ تو اس شاہنشاہ ذرہ نواز کی بارگاہِ صمدیت سے ہی مل سکتا ہے۔ جو نیتوں کا جاننے والا اور ارادوں سے واقف ہے۔ جو ساعی اس کے ہاں مشکور ہوں وہی نتیجہ خیز ہیں۔ اور جو وہاں نامقبول ہوں وہ خواہ بظاہر کیسی ہی درخشندہ و تابناک کیوں نہ ہوں۔ دنیا و آخرت میں موجب ہلاکت ہیں۔

معارف القرآن کی تمہیدی اور توضیحی عبارات میں جو کچھ لکھا گیا ہے۔ وہ میرا فہم قرآن ہے۔ اگر آپ اس سے متفق ہوں تو ہو المراد۔ لیکن اگر آپ کو اس سے اختلاف ہو تو بلا توقف اس حصہ کو نظر انداز کر دیجئے اور قرآن کریم کو از خود سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اس صورت میں یوں سمجھئے کہ میں نے آپ کے لئے قرآن کریم کی آیات کو مضامین کے اعتبار سے یکجا کر دیا ہے۔ اور بس۔ معنویت کے علاوہ چند الفاظ معارف القرآن کی صوری حیثیت سے متعلق بھی گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ چونکہ کتاب میرے اپنے ذوق کا پیکر اور زندگی کا مقصود ہے۔ اس لئے جی میں تھا کہ صوری حیثیت سے اسے نہایت پاکیزہ اور جاذب نظر بنانے کی کوشش کروں گا۔ لیکن اتفاق کہ جلد اول کی تکمیل اس زمانہ میں ہوئی جبکہ جنگ کی وجہ سے حسن ذوق کی رعایت تو کجا۔ ضروریات تک کا پورا ہونا مشکل ہو گیا۔ میرے شوق کا تقاضا تھا کہ مساعد حالات کا انتظار کیا جائے۔ لیکن احباب کی بے تابی تمنا ایک دن کا توقف بھی گوارا نہ کر سکتی تھی۔ اس لئے جو کچھ بہترین میسر ہو سکا فراہم کیا گیا۔ ماحصل آپ کے سامنے ہے۔ جی چاہتا تھا کہ اس مقام پر ان احباب کا شکریہ ادا کروں جن کی سعی و ہمت نے مجھے بہت حد تک بیجا کاوشوں سے بچا لیا۔ لیکن جھجک کر رک گیا کہ جو رشتہ قرآنی نسبت سے پیدا ہوتا ہے وہ ان تمام رسمیات سے بے نیاز ہوتا ہے۔

دعا ہے کہ یہ حقیر و بے مایہ سی متاع عزیز جو اس رب العزت کے آستانہ عالیہ پر، جھکی ہوئی نگاہ، عرق آلود پیشانی لڑکھڑاتے ہوئے قدم اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لے کر حاضر ہو رہا ہوں۔ اس کے حضور میں شرف باریابی کی تقریب بن جائے۔ نگاہ اس کی چشم کرم پر ہے۔ صلہ و معاوضہ پر نہیں کہ سنتا ہوں کہ اس کے بازار رحمت میں داد و ستد کے کچھ ایسے ہی انداز ہیں۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِن نَّسِينَا أَوْ أَخْطَأْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ۖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا ۚ أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○

غلام احمد پرویز

۱۵رجون ۔ ۱۹۴۱ء

اسلام کا نظریۂ جہاد

(۴)

(حکیم حیدر زماں صاحب صدیقی منگیری)

اسلام میں غیر مسلموں کے حقوقِ مدنیت

سوال کی دوسری شق یہ تھی کہ اسلام غیر مسلموں کو اس شرط پر زندہ رہنے کا حق دیتا ہے کہ وہ قبولِ جزیہ کے بعد محکومیت و ذلت کی زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں، یعنی حکومتِ اسلامی میں حریتِ فکر، آزادیٔ رائے اور حقوقِ مدنیت صرف اسلام کے ماننے والوں ہی کو حاصل ہوتے ہیں اور غیر مسلم ان بنیادی حقوقِ انسانیت سے یکسر محروم ہوتے ہیں اور ازبسکہ جہادِ اسلامی اثر و نتیجہ کے اعتبار سے اقوامِ دنیا کی قومی اور نسلی جنگوں سے مختلف نہیں ہے کیونکہ ان اقوام کی جنگوں کا حاصل بھی یہی کچھ ہے کہ کسی ملک پر قابض ہونے کے بعد حکومت کے نظم و نسق اور ملک کی پیداواری قوتوں کے مالک و متصرف بن جائیں اور وہاں کے اصل باشندوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور مذہبی آزادی سے محروم کر دیں یہاں تک کہ وہ اپنے قدیم آبائی وطن میں محض مسافر اور غریب الدیار انسانوں کی طرح مجبوری و ذلت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائیں۔

اس مسئلہ کی دو حیثیتیں ہیں ایک نظری اور اصولی حیثیت ہے اور دوسری عملی۔ اول الذکر حیثیت کتاب و سنت سے معلوم کی جا سکتی ہے اور دوسری کتبِ تاریخ و سیر سے۔ مسئلہ کی غیر معمولی اہمیت کے پیشِ نظر یہ ضروری ہے کہ اس کی دونوں حیثیتوں کو زیرِ بحث لایا جائے۔

گذشتہ بحث میں یہ بتایا جا چکا ہے کہ اسلام کے احکامِ صلح و جنگ اور قوانینِ دولی کا پس منظر ایک وسیع تر انسانی برادری اور ہمہ گیر امن و مساوات کے قیام کا پرخلوص عزم ہے چنانچہ اسلام کے مجموعۂ قوانینِ جنگ اور بین الملی آئین کو اگر نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو ان میں احترامِ انسانیت، اعلیٰ اخلاق اور بلند تر سیرت و کردار کی مقدس روح کارفرما نظر آتی ہے، اور اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک لمحہ کے لئے بھی یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ انسانوں سے ایسا سلوک کریں جو اخلاقی نقطۂ نظر سے معیوب ہو یا جس سے امن و صلح کے مقصدِ عظیم کو ٹھیس لگتی ہے۔ یہاں تک کہ دشمن کے اخلاق سوز اور خلافِ انسانیت اعمال کے مقابلہ میں بھی اسلام نے اپنے ماننے والوں کو یہی حکم دیا ہے کہ وہ قومی تعصب یا جذبۂ انتقام کے ماتحت ہرگز اسلامی ضابطۂ اخلاق اور ہمہ گیر اصولِ انسانیت کی خلاف ورزی نہ کریں اور وہ اس کی پرواہ نہ کریں کہ دشمن اس طرح کے

منافی اخلاق و انسانیت اعمال کا ارتکاب کر رہا ہے بلکہ مسلمانوں کو بہرحال راہِ عدل اختیار کرنی چاہیئے۔

یاایہا الذین اٰمنوا کونوا قوامین للّٰہ شہداء بالقسط ولا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوی واتقوا اللّٰہ ان اللّٰہ خبیر بما تعملون۔ (المائدہ)

اے ایمان والو! تم اللہ کے لئے حق و انصاف کے گواہ بن کر پوری قوت سے کھڑے ہو جاؤ اور تم کو کسی قوم کی دشمنی اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم کسی سے ناانصافی کرو، تم عدل کی راہ اختیار کرو کہ یہی راہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اور اللہ سے ڈرو بیشک اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

غزوۂ احد میں قریش نے مسلمانوں کے ستر آدمی شہید کئے اور حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا تو اس سے قدرتی طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت رنج ہوا اور کچھ مسلمانوں نے عزم کر لیا کہ جب ہم ان پر غالب آئیں گے تو ان کے دو چند آدمی قتل کریں گے اور ان سے ایسا ہی سلوک کریں گے جیسا انھوں نے کیا ہے۔ مگر خدائے قدوس نے اس بات کو ناپسند فرمایا کہ ملتِ اسلامی (جس کے ظہور کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ دنیا سے ظلم و ناانصافی کو ختم کرے اور عالمِ انسانی کو عدل و راستبازی کی راہ دکھائے) کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جس سے اسکی اخلاقی عظمت کو ٹھیس لگتی ہو چنانچہ مسلمانوں کو اس عزم سے باز رکھنے کیلئے ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم فھو خیر للصابرین (النحل)

اگر تم بدلہ لینا چاہتے ہو تو ان کو اتنی ہی اذیت دو جتنی تمہیں دی گئی ہے اور اگر تم صبر کرو تو اہل صبر کے لئے یہ بہت اچھی بات ہے۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا بل نصبر — ہم صبر ہی کریں گے۔

یہ منصفانہ بلکہ فیاضانہ سلوک ان کینہ پرور اور سخت گیر انسانوں سے کیا جا رہا ہے جو اس وقت کرۂ ارضی میں سب سے بڑھ کر اسلام اور مسلمانوں کے دشمن تھے مگر قرآن حکیم غیر مسلموں کے غیر محارب افراد و قبائل سے اور بھی زیادہ مروت و احسان کی اجازت دیتا ہے۔

لا ینھٰکم اللّٰہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللّٰہ یحب المقسطین (الممتحنہ) اللہ تعالیٰ تم کو ان کفار و مشرکین کے ساتھ مروت و احسان کرنے سے منع نہیں کرتا جو دین کے معاملہ میں تم سے لڑتے نہیں ہیں اور انھوں نے تم کو تمہارے گھروں سے نکالا نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ انصاف پسند لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا آیات قرآنی سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے کہ اسلام کسی انسان کو محض اختلافِ عقیدہ و مسلک کی بنا پر انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم نہیں کرتا بلکہ وہ ہر حال میں قیام بالقسط، اختیارِ عدل اور احترامِ اخوتِ بشری کا حکم دیتا ہے بلکہ ہر ممکن صورت میں اہل کفر سے بہترین سلوک اور مروت و احسان کی

تلقین کرتا ہے۔ ہاں! یہ صحیح ہے کہ اسلام ان لوگوں کو کسی طرح کی رعایت نہیں دیتا جو خدا کی زمین کو فتنہ و فساد کی آماجگاہ بنانا چاہتے ہوں اور مخلوقِ خدا کو بے وجہ نشانۂ ستم بنا رہے ہوں۔ کیونکہ اسلام اپنے سامنے ایک بلند تر مقصد رکھتا ہے جس کی تکمیل کے لئے بہرحال ایسے شریر عناصر کا استیصال ناگزیر ہے اور صرف اسی غرض کے لئے جہاد بالسیف کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔

انسانی حریت و مساوات کا غیر مبہم اعلان

عالمِ انسانی آج تک حریت و مساوات کے چشمۂ حیواں کی تلاش میں سرگرداں ہے مگر افسوس ہے کہ اس کے ماء صافی کی ایک بوند بھی آج تک اس کے لب تشنہ کو نصیب نہیں ہو سکی اور جس قدر انسان کی تشنہ لبی بڑھ رہی ہے اور اس کے ذوقِ طلب میں شدت پیدا ہو رہی ہے اسی قدر اس کی منزلِ مقصود اس کی نگاہوں سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ مگر حیرت ہے کہ صدہا ٹھوکریں کھانے کے بعد بھی اس کا قدم اسی غلط راہ پر گامزن ہے۔ اے کاش! دورِ حاضر کے انسان کو یہ کون بتائے کہ یہ پُرخطر اور کٹھن منزل علمِ فلاطون سے نہیں بلکہ دردِ دل ہی کے ذریعے طے ہو سکتی ہے۔

پُر عقل فلک پیما تر کانہ شبیخوں بہ   یک ذرہ دردِ دل از علمِ فلاطوں بہ

اگر فی الواقع انسان کو حریت و آزادی اور امن و مساوات کی خواہش ہے تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ پہلے نظریاتِ انسانی کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو کر خدائی فلسفۂ زندگی کو اپنا راہبر بنائے اور اگر وہ ایک طرف حریت و آزادی کا نعرہ بلند کرتا ہے اور دوسری طرف اس کا اپنا ذہن و فکر انسانوں کے بنائے ہوئے فلسفہ ہائے زندگی کی زنجیروں میں مقید رہے تو اس کی خواہش کی تکمیل دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔

آج عالمِ انسانی جن شدائد و خطرات میں گھرا ہوا ہے ان کا اصل سرچشمہ رنگ و نسل کا امتیاز اور وطنی عصبیت ہے۔ مگر کتاب اللہ نے چند لفظوں میں اس عقدہ کو حل کر دیا ہے۔

یاایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثیٰ وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ (آیہ)   اے لوگو! ہم نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور پھر شعوب و قبائل میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے سے (ممیز نام کے ذریعہ) پہچانے جا سکو۔ بیشک تم میں معزز تر اور بزرگ تر وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا ترس اور باعمل ہے۔

شعب سلسلۂ نسب کی ابتدائی کڑی ہے جو بعد میں آنے والی کڑیوں کے لئے مبدأ کی حیثیت رکھتی ہے اور بعد میں آنے والی کڑیوں کو "قبائل" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس سے قرآن حکیم کا منشا یہ ہے کہ سلسلۂ نسب ابتدا سے انتہا تک نفسِ انسانیت پر اثر انداز نہیں ہوتا اور ہر انسان بحیثیت انسان کے بنیادی حقوقِ انسانیت کا مستحق ہے۔ احادیثِ نبوی میں اس مسئلہ کو اس سے زیادہ وضاحت سے پیش کیا گیا ہے۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے خطبہ میں سردارِ دو جہان صلعم نے اور بہت سے اہم اجتماعی مسائل کے علاوہ اس مسئلہ پر بھی بالفاظِ ذیل تبصرہ فرمایا۔

ایھا الناس ان ربکم واحد وان اباکم واحد کلکم بنو آدم وآدم من تراب
اکرمکم عند اللہ اتقاکم ولیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقوی (جمہرۃ الخطب)

اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ تم سب آدمؑ کے بیٹے ہو اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا گیا بیشک اللہ کے نزدیک معزز تر وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ صالح اور نیک ہے اور کسی عربی کو عجمی پر تقوی کے سوا کوئی دوسری وجہ فضیلت نہیں ہے۔

ان نصوص کتاب وسنت سے ظاہر ہے کہ اسلام میں ہر انسان نفسِ انسانیت کی بنا پر ہر قسم کے عمرانی، تہذیبی اور معاشی حقوق کا مستحق ہے اور کوئی خارجی امتیاز اس کو ان حقوق سے محروم نہیں کرتا سوائے اس ایک صورت کے جس کا سطورِ بالا میں ذکر کیا گیا ہے کہ انسان خود ہی سعی فساد اور فسق و معصیت سے اپنے آپ کو اس حق سے محروم کر دے۔

حکومتِ اسلامی میں غیر مسلم رعایا کے حقوق

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ انسانیتِ عامہ سے متعلق ہے۔ مگر ان غیر مسلموں کی حیثیت اس سے مختلف ہے جو حکومتِ اسلامی میں باقاعدہ رعیت کے طور پر رہتے ہیں، یعنی ان لوگوں کے جان و مال کا تحفظ اور ان کے حقوقِ مدنیت کا احترام حکومتِ اسلامی کے لئے اخلاقی حیثیت کے علاوہ قانونی اور آئینی (لیگل) لحاظ سے بھی ضروری ہے۔ یہ اسلامی پالیٹکس کا ایک مستقل باب ہے جس پر کچھ تفصیلی تبصرہ کی ضرورت ہے۔ اور اس وقت یہی مسئلہ ہمارا موضوعِ بحث ہے۔

حکومتِ اسلامی کی غیر مسلم رعایا کو شرعی اصطلاح میں ذمی یا اہل الذمہ کہا جاتا ہے اور اس لفظ کا مفہوم بالکل ظاہر ہے کہ جو غیر مسلم حکومتِ اسلامی کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں ان کے حقوقِ جان و مال کا تحفظ حکومتِ اسلامی اپنے ذمہ لے لیتی ہے اور اس بنا پر یہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں، مگر اعدائے دین کی بدذوقی پر ماتم کرنا چاہیے کہ انھوں نے ایسے مقدس لفظ کو جو غیر مسلم رعایا کے حقوق انسانیت کی ترجمانی کر رہا ہے، اتنا خوفناک بنا دیا ہے کہ اس کے سنتے ہی جاہل اور ناواقف لوگوں پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ فیا للعجب!

حکومتِ اسلامی میں غیر مسلم رعایا سے جس طرح کا مساویانہ اور فیاضانہ سلوک کیا جاتا ہے اس کی مثال عصرِ حاضر کی کسی مملکت میں نہیں ملتی۔ حالانکہ اقوامِ حاضرہ کا دعویٰ یہ ہے کہ آج تمدنِ انسانی ارتقاء کی آخری منزل تک پہنچ چکا ہے اور ان کے نزدیک سیاست دینی زمانہ ماضی کی مقدس یادگار سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی اور موجودہ فضا کے لئے اسے ناسازگار بتایا جاتا ہے، مگر ان سے کم از کم اتنا تو دریافت کیا جا سکتا ہے کہ تم نے آج تک کوئی ایسا نظامِ سیاست و اجتماع تیار کیا ہے جو ملکی اور غیر ملکی، گورے اور کالے یا اشتراکی اور غیر اشتراکی کی تمیز نہ کرتا ہو بلکہ دنیا کے تمام انسانوں کو بلا لحاظ ملک و نسب اور عقیدہ و مسلک مساوی طور پر حریتِ فکر اور حقوقِ مدنیت عطا کرتا ہو؟ اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر کیا حرج ہے کہ تم

اس دینی نظامِ سیاست کو بھی ایک دفعہ آزما لو جس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ تمام نوعِ انسانی سے یکساں سلوک کرتا ہے اور اس کی نظر میں احمر و اسود اور ملکی و غیر ملکی کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

ہم ذیل میں نظامِ اسلامی کی ہمہ گیر افادیت کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں جس سے یہ اندازہ ہو سکے گا کہ اسلام صرف مسلمانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ غیر مسلموں کیلئے بھی آیۂ رحمت ہے۔

غیر مسلموں کے تہذیبی اور مذہبی حقوق

دشمنانِ اسلام نے محض پولیٹیکل اغراض کی بنا پر اسلام پر یہ الزام لگایا ہے کہ اسلامی ریاست میں غیر مسلم مذہبی اور تہذیبی آزادی سے محروم رکھے جاتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ حکومتِ اسلامی میں غیر مسلموں کو ہر طرح کی ثقافتی اور مذہبی رعایتیں حاصل ہوتی ہیں اور اس سلسلہ میں ان پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں ہوتی جس سے ان کی مخصوص ثقافت، علوم و فنون اور مراسمِ دینی پر زد پڑتی ہو۔ چنانچہ عہدِ نبوت میں نصاریٰ نجران، یہود خیبر اور کچھ دوسرے قبائل سے جو معاہدے طے پائے ان میں ان لوگوں پر کوئی ایسی پابندی نہیں لگائی گئی تھی جس سے ان کے مخصوص مذہبی شعائر یا تہذیب و ثقافت کو نقصان پہنچتا۔ نصاریٰ نجران کے معاہدہ میں بایں الفاظ ان کے بنیادی حقوق کی وضاحت کی گئی تھی۔

> علی اموالھم وانفسھم وارضھم وملتھم وغائبھم وشاھدھم وعشیرتھم و بیعھم وکل ماتحت ایدیھم من قلیل او کثیر (کتاب الخراج) ۔ ان کے مال، جان، زمین، مذہب، غائب، حاضر، قبیلہ، عبادت گاہوں اور ہر اس چیز پر جو ان کے قبضہ میں ہے یہ معاہدہ حاوی ہوگا۔

اسی طرح زمانۂ خلافت راشدہ میں غیر مسلم اقوام کو ہر طرح کی مذہبی اور ثقافتی آزادی حاصل تھی چنانچہ حذیفہ ابن الیمان نے ماہ دینار والوں کو جو تحریر لکھ کر دی تھی اس میں یہ الفاظ موجود تھے۔

> لا یغیرون عن ملۃ ولا یحال بینھم وبین شرائعھم (اسد الغابہ) ان کو مذہب سے برگشتہ نہ کیا جائے گا اور نہ ہی ان کے مذہبی اور ملی معاملات میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائیگی۔

جرجان کی فتح کے بعد اہلِ جرجان سے جو معاہدہ ہوا اس میں یہ الفاظ تھے۔

> لھم الامان علی انفسھم واموالھم وملتھم وشرائعھم۔ (طبری) ان کی جان و مال اور ملت و شریعت کے معاملہ میں ان کے لئے امان ہے۔

آذربائیجان کے معاہدہ میں بھی قریب قریب یہی الفاظ تھے۔

> الامان علی انفسھم واموالھم وملتھم وشرائعھم (الفاروق بحوالہ طبری) ان کی جان، ان کے اموال، ان کی ملت، ان کی شریعت پر امان حاوی ہوگی۔

خلافتِ اسلامی میں قانونی اور عدالتی مساوات

جہاں تک قانونی اور تعزیری مساوات کا تعلق ہے قرآن حکیم نے واضح الفاظ میں تاکید کی ہے کہ غیر مسلموں سے پورا انصاف کیا جائے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اسلامی عدالت و قانون کی نظر میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں ہے۔

وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین (المائدہ) اگر آپ ان (اہل کتاب) کے حکم بنیں تو عدل و انصاف کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کریں کہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ گورنر کوفہ کے نام جو فرمان بھیجا تھا اس کے چند الفاظ یہ ہیں۔

اما بعد فان القضاء فریضۃ محکمۃ وسنۃ متبعۃ فافھم اذا ادلی الیک وبین الناس فی وجھک ومجلسک وعدلک (طبقات الفقہاء) قضاء فریضہ محکم اور واجب الاتباع سنت ہے تم لوگوں کے درمیان اپنے حضور میں اپنی مجلس میں اور عدالت میں مساوی سلوک کرو۔

اسلام نے غیر مسلم رعایا کو جس طرح کے مساوی حقوق دیئے ہیں ان سے زیادہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی اسلامی شریعت میں مسلمانوں اور ذمی رعایا کے حقوق جان و مال میں کوئی قانونی فرق نہیں ہے۔ اور ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر رکھی گئی ہے۔ یعنی اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو شرعی قانون کے مطابق اس مسلمان سے قصاص یا دیت لی جائے گی چنانچہ یہ مسئلہ باقاعدہ قانون کی شکل میں کتب فقہ میں موجود ہے۔

فان بذلوھا فلھم ما للمسلمین وعلیھم ما علی المسلمین (ہدایہ کتاب السیر)

اگر وہ جزیہ دینا قبول کر لیں تو وہ ہر طرح کے نفع و نقصان میں مسلمانوں کے برابر ہوں گے۔

زمانۂ خلافتِ راشدہ میں اسی پر عمل رہا۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں ایک مسلمان نے یہودی کو قتل کر دیا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس کو ایک بڑا سانحہ تصور کیا اور فرمایا "میرے زمانۂ خلافت میں انسانوں کا خون ہو؟ میں تم کو قسم دلاتا ہوں کہ جسے قاتل کا علم ہو وہ مجھے بتائے"۔ بکر ابن شداخ نے کہا "امیر المومنین! اس کا قاتل میں ہوں"۔ فرمایا "تو پھر تم سے قصاص لیا جائے گا یا اپنی برأت بیان کرو"۔

اسی طرح حضرت علیؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر دیا۔ یہ معاملہ حضرت علیؓ کے سامنے پیش ہوا تو انھوں نے قصاص کا حکم دیا لیکن مقتول کے وارثوں نے قاتل کو معاف کر دیا۔ مگر پھر بھی حضرت علیؓ نے ورثاء سے دریافت فرمایا کہ تمہیں کسی نے دھمکی تو نہیں دی؟ ورثاء نے کہا کہ ہم نے اپنی مرضی سے اس کو معاف کر دیا ہے کیونکہ اسے قتل کرنے سے ہمارا بھائی زندہ نہیں ہو سکتا اور قاتل نے اس کا معاوضہ ادا کر دیا ہے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کے عہد خلافت میں حیرہ کے ایک مسلمان نے ذمی کو قتل کر دیا۔ امیر المومنین نے

وہاں کے گورنر کو لکھا کہ قاتل کو مقتول کے ورثا کے حوالے کر دو۔ وہ چاہیں تو اسے قتل کریں یا معاف کر دیں۔ چنانچہ قاتل کو ورثا کے حوالے کر دیا گیا اور انھوں نے اس کو قتل کر دیا۔

مندرجہ بالا واقعات کے علاوہ تاریخ اسلامی میں اور کئی اس طرح کے واقعات ملتے ہیں جنکی تفصیل اس مقام پر مشکل ہے۔

اس کے علاوہ اسلام نے غیر مسلم اقوام کی داخلی عدالتی خود مختاری قائم رکھی ہے۔ چنانچہ نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا گیا تھا اور جس کا متن ابن سعد وغیرہ کتب تاریخ میں مذکور ہے، اس میں اس کی وضاحت موجود ہے۔

غیر مسلموں کے حقوقِ معیشت

حکومتِ اسلامی میں مسلمانوں کی طرح غیر مسلموں کو بھی تمام اقتصادی اور معاشی حقوق حاصل ہوتے ہیں چنانچہ سطور بالا میں جن معاہدات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں صراحت سے ان کی جائداد زمین اور دیگر املاک کا ذکر موجود ہے، بالخصوص نصاریٰ نجران سے جو معاہدہ ہوا اس میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "وکل ما تحت ایدیھم من قلیل او کثیر" کے عمومی الفاظ سے ان کے حقوق مال کو تسلیم کیا۔

حضرت عمرؓ اپنے عمال حکومت کو بار بار تاکید فرماتے تھے کہ اہل الذمہ سے کئے گئے معاہدات پر سختی سے عمل کیا جائے اور ان کی جان و مال پر کسی طرح کی تعدی نہ کی جائے۔ چنانچہ فتح شام کے بعد انھوں نے ابو عبیدہؓ کو تحریر فرمایا تھا۔

> وامنع المسلمین من ظلمھم والاضرار بھم واکلھم اموالھم وافٍ لھم بشرطھم الذی شرطت لھم فی جمیع ما اعطیتھم (کتاب الخراج) آپ مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرنے، ان کو نقصان پہنچانے اور ان کا مال غصب کرنے سے روک دیں اور معاہدہ میں جو حقوق آپ نے تسلیم کئے ہیں ان سب کی تکمیل کریں۔

بلکہ حضرت عمرؓ نے اپنی زندگی کے آخری لمحات میں اپنے جانشین کو یہ وصیت فرمائی تھی۔

> اوصیہ بذمۃ اللہ وذمۃ رسولہ ان یوفی لھم بعھدھم (بخاری) میں اس کو اللہ اور اس کے رسول کے عہد کی وصیت کرتا ہوں کہ وہ ذمیوں کے حقوق پورے کرے۔

اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ کوئی مسلمان ذمیوں کے اموال و املاک کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھ سکتا تھا۔ اور حضرت عمرؓ نے تو اس معاملہ میں اس حد تک مبالغہ کیا کہ مسلمانوں کے لئے ان کی زمینیں خریدنا ممنوع قرار دیدیا، کیونکہ اس سے یہ ممکن تھا کہ تمام زمینیں اہل عرب کے قبضہ میں آجائیں اور ذمی رعایا کسب معاش سے محروم ہو جاتی۔

دولت بنی امیہ کے جابر حکمرانوں نے ذمیوں کی کچھ زمینیں غصب کر لی تھیں اور ان کو شاہی خاندانوں میں جاگیر کے طور پر تقسیم کر دیا تھا، مگر حضرت عمر ابن العزیزؒ نے ایسی تمام زمینیں ذمیوں کو واپس کر دیں، چنانچہ ایک ذمی نے عباس ابن الولید کے خلاف دعویٰ دائر کیا کہ اس نے میری زمین پر غاصبانہ قبضہ کر لیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے عباس ابن الولید سے مخاطب ہو کر کہا کہ تم اس کا کیا جواب دیتے ہو؟ کہا یہ زمین مجھے ولید نے جاگیر کے طور پر دی ہے اور میرے پاس اس کی سند موجود ہے، آپ نے فرمایا کہ خدا کی کتاب ولید کی سند سے مقدم ہے اور ذمی کو زمین واپس دلا دی۔

اس کے علاوہ حکومت اسلامی میں اہل الذمہ کو تجارت، زراعت اور ہر طرح کے کاروبار کی مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے، چنانچہ زمانۂ خلافت راشدہ میں ان لوگوں کو ہر طرح کی کاروباری آزادی حاصل تھی بلکہ ان کو اس سلسلہ میں خاص رعایتیں دی جاتی تھیں تاکہ ملک میں اشیاء تجارت کی نقل و حرکت وسیع پیمانہ پر جاری رہے اور عوام کو کسی چیز کے حصول میں دقت نہ اٹھانی پڑے۔

سازشی عناصر سے حسنِ سلوک

دنیا کی کوئی حکومت ایسے لوگوں کو قطعاً معاف نہیں کرتی جو در پردہ مملکت کے دشمنوں سے ساز باز رکھتے ہوں اور سیاسی نقطۂ نظر سے یہ ہمیشہ ایک سنگین تر جرم تصور کیا جاتا رہا ہے جس کی سزا قتل یا کم از کم غیر مشروط جلاوطنی ہی ہو سکتی ہے اور دنیا کی حکومتوں میں ایسے لوگوں کے لئے کسی رعایت کا تصور بھی نہیں کیا جاتا مگر خلافت اسلامی کی یہ مایۂ صد فخر خصوصیت ہے کہ یہ ایسے شریر عناصر سے بھی مہما امکن بہتر سلوک کرتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلامی کے مطالعہ سے آپ معلوم کر سکیں گے کہ خلافت راشدہ کے مقدس دور میں کئی ایسے قبائل و اشخاص کو جو اس جرم کے مرتکب ہوئے تھے نوعیتِ جرم کے مقابلہ میں کمتر سزا دی گئی یعنی کافی مہلت دینے کے بعد زیادہ سے زیادہ ان کو جلاوطن کیا گیا اور پھر اس میں بھی ان کو یہ رعایت دی گئی کہ ان کے املاک و مقبوضات کا ان کو باقاعدہ معاوضہ دیا گیا اور ان کے لئے دوسری جگہ قیام کرنے کا حکومت اسلامی کی طرف سے انتظام کیا گیا۔

عربسوس (شام) کے لوگ در پردہ رومیوں سے ساز باز رکھتے تھے، اس علاقہ کے حاکم عمیر ابن سعدؓ نے حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی۔ حضرت عمرؓ نے جواب میں لکھا کہ ان کے پاس جسقدر جائدادیں اور مال و مویشی ہیں ان کو باقاعدہ طور پر شمار کر کے ایک ایک چیز کی دگنا قیمت ان کو دیدو اور ان سے کہدو کہ کسی دوسری جگہ چلے جائیں، اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو ان کو ایک سال کی مہلت دو۔ مگر چونکہ وہ اس رعایت کے بعد بھی شرارتوں سے باز نہ آئے اس لئے بالآخر ان کو جلاوطن کر دیا گیا۔

فدک کے یہودیوں کو جس وقت پولیٹیکل سازشوں کی وجہ سے جلاوطن کیا گیا تو ان کے باغات اور زمینوں کی پوری پوری قیمت ادا کر دی گئی۔

مگر نجران کے عیسائیوں سے جو بہترین سلوک کیا گیا وہ سب سے زیادہ حیران کن ہے۔ چنانچہ ان کو جب عرب سے نکالا گیا اور شام و عراق میں آباد کیا گیا تو ان کو جو دستاویز لکھ کر دی گئی اس میں ذیل کی رعایتیں مرقوم تھیں۔

(۱) یہ لوگ جہاں قیام کرنا چاہیں وہاں کے حکام ان کو رہائش اور زراعت کیلئے زمین دیں۔

(۲) چوبیس ماہ تک ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔

(۳) جس مسلمان کے پاس یہ لوگ فریاد لے کر جائیں وہ ان کی مدد کرے۔

(الفاروق بحوالہ کتاب الخراج ملا؟)

یہ بحث اپنی اہمیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں کو زیر تحریر لایا جائے مگر چونکہ یہ ایک مستقل بحث ہے اور ہمارے اصل موضوع (اسلام کا نظریۂ جہاد) میں اس کے تفصیلی گوشوں کو کھپانا نہ صرف مشکل ہے بلکہ غیر موزوں بھی ہے اس لئے اب اس بحث کو ختم کیا جاتا ہے۔ مگر مذکورہ تصریحات سے اتنا سمجھا جا سکتا ہے کہ جہادِ اسلامی کی غرض و غایت ہرگز یہ نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ ایسی ریاست قائم کی جائے جو صرف اسلام کے ماننے والوں ہی کو حقوقِ انسانیت عطا کرے اور دوسری اقوام و ملل اس کے ماتحت انسانیت کے بنیادی حقوق سے محروم ہوں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جہادِ اسلامی کے ذریعہ ایک ایسی مثالی ریاست (آئیڈیل سٹیٹ) قائم کی جاتی ہے جو بلا لحاظ عقیدہ و فکر اور رنگ و نسل تمام انسانوں کو حریتِ فکر، آزادیٔ معیشت اور تمام دوسرے حقوقِ مدنیت عطا کرتی ہے۔

نظامِ اسلامی سے غیر مسلموں کی وجہِ نفرت

گذشتہ بحث سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نظامِ اسلامی اگر فی الحقیقت اپنے اندر اتنے محاسن رکھتا ہے تو پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ غیر مسلم نظامِ اسلامی کا نام سنتے ہی لرزہ براندام ہو جاتے ہیں؟

یہ سوال بظاہر وزن دار معلوم ہوتا ہے اور اتنا ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ غیر مسلموں کو اتنی نفرت کسی چیز سے نہیں ہے جتنی کہ حکومتِ اسلامی کے نام اور بالخصوص جہاد، جزیہ اور ذمی کی اسلامی اصطلاحات سے ان کو نفرت ہے۔ مگر اس شدید نفرت کا باعث چند خارجی امور ہیں جن کا نظامِ اسلامی سے کسی طرح کا تعلق نہیں ہے۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ دورِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے بعد حکومتِ اسلامی یا خلافتِ اسلامیہ کے نام سے جو حکومتیں بنتی رہی ہیں ان میں سے بیشتر حکومتیں حقیقت میں اسلامی حکومتیں نہ تھیں اور ان میں وہ سب کچھ ہوتا رہا جو کسی لادینی سٹیٹ میں ہو سکتا ہے مگر چونکہ ان کا ظاہری لیبل اسلام ہی تھا اس لئے دوسری قومیں یہی سمجھتی رہی ہیں کہ حکومتِ اسلامی کا نظامِ سیاست ایسا ہی ہے۔ حالانکہ اس میں نظامِ اسلامی کا کوئی قصور نہ تھا بلکہ قصور ان حکمرانوں کا تھا جو اسلام کے نام سے لادینی طرز پر حکومت کا نظم و نسق چلاتے رہے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عہدِ حاضر میں عقل و بصیرت اور انصاف و دیانت کی جگہ قومی تعصب نے لے لی ہے۔ یعنی اقوامِ حاضرہ کے نزدیک اشیا کے حسن و قبح کا صرف ایک ہی معیار ہے کہ جو چیز اپنی قوم کی طرف منسوب ہے وہ اچھی ہے اور جو کسی دوسری قوم سے نسبت رکھتی ہے وہ بری ہے، بس اسی معیار پر ہر چیز کو پرکھا جاتا ہے اور اس سلسلہ میں ان کو کسی دوسری دلیل کی قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ اور پھر مسلمانوں

کے ساتھ ان اقوام کو طبعاً زیادہ عناد ہونا چاہئے کہ انھوں نے مسلسل ایک ہزار سال تمام کرۂ ارضی پر حکومت کی ہے اور اس عرصہ میں دنیا کی تمام بڑی بڑی اقوام کو طوعاً و کرہاً اقتدارِ اسلامی کے آگے سرنگوں ہونا پڑا مگر دل سے کوئی قوم فطرۃً اس بات کو برداشت نہیں کرتی کہ اس کی مسندِ حکومت پر کوئی دوسری قوم قابض ہو چنانچہ یہ قومیں مرکزیتِ اسلامی کو فنا کرنے کے لئے ابتدا ہی سے درپردہ سازشیں کرتی رہیں اور خود مسلم حکمرانوں کی نالائقیوں اور ملت کے غداروں کی دسیسہ کاریوں نے دشمنانِ اسلام کے عزائم کو اور زیادہ تقویت بہم پہنچائی (چنانچہ اب بھی مملکتِ پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک اسی دوگونہ کشمکش میں مبتلا ہیں) اور بالآخر وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوئے یعنی مرکزیتِ اسلامی ان کے ہاتھوں تباہ ہوئی اور شیرازۂ ملت بکھر گیا، اور بالآخر وہ وقت آپہنچا جس کا ان اقوام کو صدیوں سے انتظار تھا۔ اور اب انھوں نے مسلمانوں سے جی بھر کر انتقام لینا شروع کیا۔ چنانچہ ملتِ مسیحی ایک حد تک اس کام سے فارغ ہو چکی ہے اور ہندو اور یہود کو اب اس کا موقع ملا ہے یعنی بیت المقدس کی صلیبی جنگوں، ہسپانیہ کی حسرتناک تباہی، طرابلس الغرب اور سوڈان کے مسلمانوں کے قتلِ عام، سقوطِ مصر و شام اور سلطنتِ ترکیہ کی بربادی کی داستانیں اب پرانی ہو چکی ہیں، مگر یہود کے ہاتھوں فلسطین کی سرزمین اور ہندو کے ہاتھوں بہار، دہلی، مشرقی پنجاب اور کشمیر کی زمین کا چپہ چپہ مسلمانوں کے خونِ ناحق سے ابتک لالہ زار بنا ہوا ہے اور فرزندانِ توحید کی لاشیں اب بھی کہیں کہیں بکھری پڑی ہیں جو تاریخِ انسانی کی سب سے بڑی سفاکی کی یاد دلا رہی ہیں۔ ہاں ہمگران شہیدانِ حق کی روحیں بارگاہِ خداوندی میں سربسجود ہو کے فریاد کر رہی ہیں کہ کیا تیری دنیا میں آج کوئی نہیں جو لاکھوں بے گناہ انسانوں کے خونِ ناحق کا انتقام لے؟

قصہ کوتاہ یہ کہ دشمنانِ اسلام دو تین صدیوں سے مسلمانوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں وہ ایک بہت بڑی طولانی داستان ہے جو اپنے اندر درد و کرب اور دل آویزی کی متضاد کیفیتیں رکھتی ہے۔

حدیثِ درد دل آویز داستانے ہست — کہ ذوق بیش دہد چوں دراز تر گردد

بہرحال ان اقوام کو مسلمانوں سے اس قدر شدید سیاسی اور مذہبی تعصب ہے کہ ان کی ہر ادا ان کے زخمی دلوں پر نمک پاشی کا کام کرتی ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کسی ایسے نظامِ سیاست کو تسلیم کر لیں جو اسلام اور مسلمانوں سے نسبت رکھتا ہے۔

سطورِ بالا میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک دردناک حقیقت ہے جو الفاظ بن کر زبانِ قلم پر آگئی ہے مگر اس سے مقصد صدیوں کی رقابت کو ابھارنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ موجودہ اقوام (جن میں مسلمان بھی شامل ہیں) ماضی کی تلخ یاد کو بھلا دیں اور آئندہ کے لئے سوچ سمجھ کر ایسی راہ اختیار کریں جس سے تمام دنیائے انسانیت عیشِ دائم اور مسلسل امن و خوشحالی سے ہمکنار ہو سکے۔

وہ صرف اسلام کی راہ ہے۔

"جسارت"؟

مغربی پنجاب کے رئیسوں کی رقیبانہ کشمکش کی روشنی میں

نہیں تخصیص کچھ اس میں وزارت اور صدارت کی — بسا اوقات زرداروں نے ملّت کی تجارت کی
"متاع دین و دانش لوٹ کر اللہ والوں کی" — جو اک دولت حمیت کی تھی باقی وہ بھی غارت کی
مناصب کے لئے ہر حیلہ، ہر کاوش "تو باقی" ہے — نہیں باقی تو سینوں میں رمق ملّی حرارت کی!
امیروں نے دیئے ہیں نت نئے دھوکے غریبوں کو — ہوس کے کھیل نے محنت مسلماں کی اکارت کی
ادھر جلسے ہیں اور جلسوں میں لچھّے دار تقریریں — ادھر آمادۂ پیکار ہے "اولاد بھارت کی"
عوام النّاس کو جُل دے کے یہ فرمایا جاتا ہے — مدبّر وہ ہے پیدا جس نے اس فن میں مہارت کی
بجا ارشاد! آپ اس فن میں ماہر ہی سہی لیکن — نظر بہچانیئے ملّت کے غصّے اور حقارت کی
تھا نقشہ دیدنی کشمیر کا تیغوں کے سائے میں — نہ کیوں شمشیر در کف آپ نے اس کی زیارت کی
اجازت ہو تو یہ بھی عرض کر ڈالوں لگے ہاتھوں — نہ توہین اتنی کیجے چشم جبرت کی بصارت کی
بڑھا تھا جانب کشمیر دشمن کر کے یہ نیّت — بجا دے اینٹ سے اینٹ آپکی اونچی عمارت کی
اگر ملت کی نوزائیدہ آزادی پہ آنچ آ ئی — تو کچھ لذت صدارت میں نہ کچھ عزت وزارت کی!
یہاں بھی مشرقی پنجاب کا کھنچ جائیگا نقشہ — اُکھڑ جائیں گی بنیادیں تمدن اور حضارت کی

سنے گا کون یہ آواز اونچی بارگاہوں میں — جہاں ہے کارفرما آرزو ذاتی امارت کی
ضمیر بے ضمیری فاش کرنا تھا سو کر ڈالا — سزا اب دیکھئے دیتے ہیں کیا وہ اس شرارت کی

غلامی ہو کہ آزادی لٹک جاتا ہے سولی پر
ذرا بھی جس نے سچی بات کہنے کی جسارت کی

[illegible]

یہ ہندوستان ہے

(۱) سالم سنٹرل جیل (صوبہ مدراس) کے ۳۳ قیدیوں نے بھوک ہڑتال کردی۔ اس پر انھیں قید خانہ کے قانون کی دفعہ ۵۲ کے ماتحت، دو دو ماہ سے لیکر چھ چھ ماہ تک مزید قید کی سزائیں دی گئیں "

(فری پریس جرنل مورخہ ۷ ۱۲/۴۸)

بھوک ہڑتال وہ حربہ ہے جسے مسٹر گاندھی نے عام کیا اور کانگریس اسے ہمیشہ اہمسا کا بلند ترین اصول قرار دیتی رہی۔ آج وہی کانگریس حکومت اسے سنگین جرم قرار دے رہی ہے اور اس کی پاداش میں سزائیں دی جارہی ہیں! اُس وقت وہ حربہ انگریزوں کے خلاف تھا اس لئے انسانیت کا بلند ترین اصول آج وہ اپنے خلاف ہے، اس لئے سنگین جرم! یہ ہے نتیجہ زندگی کو مستقل اقدار سے الگ رکھنے کا!

---

(۲) میں، مسٹر۔۔۔ کی تجویز سے اختلاف کرتا ہوں۔۔۔ ہندوستان سے، ہندو اور مسلمان قسم کے الفاظ یکسر نابود کردینے چاہئیں۔ یہ تفریق، ترقی کی راہ میں سنگ گراں ہے۔ جونہی ہم نے محسوس کرلیا کہ ہم (فقط) "ہندوستانی" ہیں، موجودہ تصادم کی جگہ خوش حالی اور خیر سگالی آجائے گی "

(مسٹر ایم، رئیس، ایچ، قریشی کا خط جو ۳۰ نومبر کے اسٹیٹسمین میں شائع ہوا۔)

اس خط سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں پر کیا گذر رہی ہے!

---

(۳) حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی صدر جمعیت العلماء اجلاس امروہہ کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرماتے ہیں۔

تقسیم ہند کے بعد ہندو فرقہ پرستی پورے شباب پر ہے اور صحیح بات کہنے والا ہندوستانی آج بے اثر ہوچکا ہے۔ ہندو فرقہ پرستی نے مہاتما گاندھی جیسی بے نظیر شخصیت کی جان لی اور ہندوستان کو نہیں بلکہ دنیا کو سچے رہنما سے محروم کردیا۔ اس لئے آج کے ہندوستان میں صحیح بات کہنا بہت مشکل ہے۔ مگر سچ کہنا چاہئے اس لئے کہ کبھی نہ کبھی وہ قبول ہی کیا جاتا ہے۔ آج ہندوستان میں فرقہ پرستی کا زہر کانگرس کے اندر اور باہر ترقی کررہا ہے۔

حکومت ہند کے سامنے اس وقت دو مشکلات ہیں۔ ایک طرف وہ دنیا کو یہ بتانا چاہتی ہے کہ

ہندوستانی حکومت غیر مذہبی حکومت ہے۔ دوسری طرف ہندو فرقہ پرستی سے خائف ہے لیکن اس کی یہ مذبذب حالت مسلمانوں کے لئے سخت تکلیف دہ ہے۔

(یہ لدھیانوی صاحب وہی بزرگ ہیں جنھیں کانگرس کے مقابلہ میں لیگ میں شرکت پر خالص "شرعی" اعتراض تھا۔)

---

(۴) یہاں کے مسلمان اگر انڈین یونین کے وفادار رہنا چاہتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ ہندی کو اپنائیں اور ہندوستان کی تہذیب اختیار کریں۔ ان کے اپنے تمدن اور زبان کی اب ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔

یہ صوبہ متحدہ کے صدر کانگرس اور صوبہ اسمبلی کے سپیکر راج رشی ٹنڈن جی نے اپنی لکھنؤ اور دہلی کی تقریروں میں بار بار فرمایا اور ایسا وہ فرماتے ہی رہتے ہیں۔ بھولے بھالے مسلمان اب جاکر سمجھے کہ ان کا اطمینان قلب قبل ازوقت تھا، جب وہ واقعۂ حیدرآباد کے بعد پنت جی وزیر اعظم یوپی کی زبان سے یہ سن کر خوش ہو گئے تھے کہ "اب مسلمانوں سے وفاداری کے کسی مزید مطالبہ کی ضرورت نہیں" ابھی تو اپنا تمدن چھوڑنے اور اپنی زبان ترک کرنے کے مطالبات باقی ہیں!

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ ایسی تقریریں، گاندھی جی کے یوم پیدائش کے موقع پر، عین ہندو مسلم اتحاد کے سلسلہ میں کی جاتی ہیں۔ (صدق لکھنؤ ۳ $\frac{۱۲}{۴۸}$)

---

(۵) معاصر الجمعیت دہلی کے صفحات میں ایک مراسلہ:۔

جیسا کہ اندیشہ تھا آخر وہ گھڑی آکر ہی رہی اور کل راجستان یونین کا حکم آگیا کہ ٹونک کے محکمۂ شریعت کو ختم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اب تک انفرادی اور اجتماعی جو کوشش کی گئی تھی اور جمعیت العلماء ہند نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا تھا افسوس وہ بے سود رہا۔ ان چھ ماہ میں تعطیلِ جمعہ اور اسلامی تعطیلات کی منسوخی، ذبیحہ گاؤ کی بندش اور بہت سے ملازموں کی برطرفی اور اردو کی جگہ ہندی کو مسلمان پورے صبر و سکون سے برداشت کرتے رہے۔ لیکن اب محکمۂ شریعت کے خاتمہ نے ان کو حد سے زیادہ روحانی تکلیف میں مبتلا کر دیا ہے۔

---

(۶) ہندوستان کا ایک نیشنلسٹ اخبار "حقیقت" لکھتا ہے:۔

ہم سے متعدد قوم پرست مسلمانوں نے شکایت کی ہے کہ گذشتہ سنیچر کی شام کو امین الدولہ پارک میں صوبہ کانگرس کے صدر بابو پرشوتم داس ٹنڈن نے گاندھی جی کی سالگرہ کے جلسہ میں جو تقریر

کی وہ بے انتہا مسلم آزار تھی۔ ٹنڈن جی نے حسبِ معمول ہندوستان کے مسلمانوں سے اپنا تمدن ترک کر کے ہندوانہ تمدن اختیار کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس تقریر کی پوری رپورٹ تو ہمارے پیشِ نظر نہیں لیکن ٹنڈن جی جس قسم کی تقریریں مسلمانوں کے خلاف برابر کرتے رہتے ہیں وہ سب کو معلوم ہے۔ آج کل وہ مسلمانوں سے اپنا تمدن ترک کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں تو کل وہ قرآن مجید پڑھنے سے بھی منع کریں گے کیونکہ وہ بھی ایک بدیشی زبان میں ہے۔ قبلہ رو نماز پڑھنے سے بھی روکیں گے کیونکہ مسلمانوں کا قبلہ (مکہ) ایک غیر ملک (عرب) میں ہے۔ اور بالآخر اسلام ترک کر دینے پر بھی اصرار ہو گا کیونکہ پیغمبرِ اسلام بھی ایک غیر ملک کے رہنے والے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس جماعت (کانگرس) کا ایک بہت بڑا ذمہ دار لیڈر مسلمانوں کے خلاف ایسی شدید دشمنی اور عداوت کا اظہار کر رہا ہے اس کی تقریریں پڑھنے کے بعد مسلمانوں کو . . . .

. . . .

اس جماعت (کانگرس) کی طرف یقیناً رغبت نہیں ہو گی بلکہ اس سے نفرت ہی ہو گی۔ اس لئے خود کانگرس کے مفاد کے لئے بھی اور نیز مسلمانوں کے لئے بھی بہتر ہے کہ وہ ان جلسوں میں جانے کی تعلی پر ہیز کریں جن میں ٹنڈن جی تقریر کرنے والے ہوں۔

---

(۷) ۔ "اے پی آئی کی خبر:۔

پٹنہ۔ ۲۹ر مئی ۱۹۴۸ء سرکار بہار نے اعلان کیا ہے کہ صوبہ کے اندر جن میونسپلٹیوں نے مویشیوں کے ذبیحہ کو اپنے حدود کے اندر گائے کے گوشت کی فروخت کو ممنوع قرار دیا ہے انھوں نے اپنے حدود اختیارات سے تجاوز کیا ہے۔ اعلان کا بیان ہے کہ سرکار نے ان احکام کے قانونی پہلوؤں پر خوب غور کر لیا ہے اور فروخت لحم بقر کی ممانعت کے احکام صادر کرنا بہار واڑیسہ میونسپل ایکٹ کے حدود سے باہر قدم نکالنا ہے۔ ایکٹ کے بموجب میونسپل کمشنران اس قسم کے احکام صادر کرنے کے بالکل مجاز نہیں۔

اب اللہ جانے کہ ہمارے صوبہ (یو پی) کا میونسپل ایکٹ بہار میونسپل ایکٹ سے کچھ مختلف ہے یا کیا اب تک ہمارے صوبہ میں اس قسم کا کوئی اعلان شائع کرنے کی ضرورت ہماری صوبہ سرکار نے محسوس نہیں فرمائی۔ حالانکہ پڑوس کے صوبہ بہار میں اسے شائع ہوئے ہفتوں نہیں مہینوں ہو چکے ہیں۔" (صدق لکھنؤ ۱۰ ۱۲/۴۸)

---

(۸) ۔ "نئی دہلی۔ ۳۰ر نومبر۔ آج وزارت کے ایک نمائندہ نے اپنے بیان میں کہا کہ وزارتِ ہند اور ریاست بھوپال کے درمیان کسی قسم کا بھی اختلاف موجود نہیں۔ اس دوران میں یہ خبریں شائع ہوئی ہیں کہ [illegible]

اور ریاست بھوپال کے درمیان شدید اختلافات ہیں، یہاں تک کہ ایک نئے اخبار نے تو یہی چھاپ دیا کہ سرکارِ ہند نواب بھوپال کو ان کی مخالفِ ہند کارروائیوں کی بنا پر حراست میں لے لینے والی ہے۔ یہ خبریں تمام تر بے بنیاد ہیں اور ہماری منسٹری اور ریاست کے درمیان کوئی نزاع ہے ہی نہیں۔" (اے۔ پی۔ آئی)

خبریں بے بنیاد تو ہوا کریں۔ کیا ہماری سرکار واقف نہیں کہ "خبر سازی" خود کتنا بڑا فن ہے اور ہمارے اہلِ صحافت اس فنِ لطیف کو معراجِ کمال پر پہنچا چکے ہیں۔ حیدرآباد کا معاملہ یکسو ہو جانے کے بعد ہماری نیوز ایجنسیاں اگر بھوپال کو بھی ہدف نہ بنا لیتیں تو آخر بے چاروں کا مشغلہ ہی کیا رہ جاتا! کوئی دن مشکل ہی سے ایسا گذرتا ہوگا کہ کوئی نئی سنسنی بھوپال کے لئے تصنیف نہ ہوتی ہو۔" (صدق ۱۰ ۱۲/۴۸)

---

(۹)۔ دہلی کے مسلمانوں کے جلسہ کا ایک منظر۔

دہلی ۲۰ رنومبر بخشی غلام محمد نائب وزیر اعظم کشمیر نے آج جامع مسجد میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ محاذِ کشمیر پر ہندو اور سکھ ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی لڑ رہے ہیں۔ لیکن اس امر کی شکایت کی کہ ہندوستان کے مسلمان کشمیر کے معاملہ میں اتنی دلچسپی نہیں لے رہے ہیں جتنی لینی چاہیئے۔ حاضرین میں سے ایک نیشنلسٹ مسلمان مسٹر عبداللہ فاروقی نے کھڑے ہو کر کہا کہ آپ یہ بتائیں کہ آج جب ہماری پوزیشن یہ ہے کہ ہم قرول باغ اور سبزی منڈی تک میں نہیں جا سکتے تو پورا مشرقی پنجاب پار کر کے آپ کی امداد کے لئے کیسے پہنچیں۔ . . . . . مسٹر بخشی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ ایک غیر مذہبی حکومت کے دارالسلطنت میں ہندو مسلمانوں کے علاقے تقسیم ہیں۔ اور امید ظاہر کی کہ بہت جلد یہ صورت حالات ختم ہو جائے گی۔ اس سلسلہ میں آپ نے امداد اور اربابِ حکومت سے بھی گفت و شنید کرنے کا وعدہ کیا۔

---

(۱۰)۔ "پنڈت سندر لال نے (جامع مسجد دہلی میں) مسلمانوں کو نصیحت کی کہ اگر ان کے ساتھ کسی قسم کی سختی ہوئی ہو تو انھیں اس سختی کو ان لوگوں کی طرف سے کفارہ سمجھ کر برداشت کر لینا چاہیئے جنھوں نے پاکستان بنوایا۔ آخر تمہیں میں سے وہ لوگ تھے جو "لے کے رہیں گے پاکستان" اور "بٹ کے رہے گا ہندوستان" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔

پنڈت سندر لال کی تقریر کے بعد بخشی غلام محمد نے دوبارہ کھڑے ہو کر پنڈت جی کی اس بات سے اختلاف کیا کہ ہند کے مسلمانوں کے ساتھ اگر کوئی زیادتی ہو تو وہ پاکستان میں غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا کفارہ سمجھ کر برداشت کر لیں۔ آپ نے کہا کہ پاکستان والے اپنی حکومت کو ہمیشہ سے ایک مذہبی حکومت بتاتے ہیں۔ وہ اگر غیر مسلموں کے ساتھ ناروا سلوک کرتے ہیں تو کریں۔ لیکن جس ہندوستان میں غیر مذہبی اور جمہوری حکومت کا اعلان کیا گیا ہے وہاں غیر مساوی سلوک کو کسی طرح برداشت نہیں کیا جا سکتا اور نہ اسے صحیح اور جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔"

(۱۱) - ۲۸ نومبر: آج الیکشن ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا الیکشن۔ الیکشنوں میں کیا کچھ نہیں ہوتا؟ مقدمہ کی طرح الیکشن کا نام ہی اس موقع کا ہے جب جائز و ناجائز کا امتیاز اٹھ جائے اور شرافت رذالت میں تبدیل ہو جائے۔ اپنی پارٹی کے امیدوار کا ہر عیب، ہنر بن جائے اور فریق مقابل کے ہاں کا ہر پھول کانٹا بن کر کھٹکنے لگے۔ ۱۹۳۵ء کا الیکشن کیا یاد نہیں ہے؟ سر ضیاء الدین احمد مرحوم لائے جا رہے اور نواب محمد اسمٰعیل خاں ہٹائے جا رہے تھے۔ شوکت علی اور ڈاکٹر انصاری اور فلاں اور فلاں نے بہت کچھ ہاتھ پیر مارے۔ وائسرائے بہادر لارڈ ولنگڈن کی زور آزوری کے آگے کسی کی کچھ نہ چلی۔ بقول شخصے

کسی کی کچھ نہیں چلتی ہے جب تقدیر پھرتی ہے

قوم ہاری، لاٹ صاحب جیتے ـــ ۱۳ برس کے عرصہ میں دنیا الٹ پلٹ ہو گئی۔ نواب محمد اسمٰعیل خاں صاحب کا مقدر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ آج وہ پھر اپنے عہدہ سے ہٹائے جانے والے ہیں۔ ٹھیک بدیسی سرکار کی طرح سودیشی سرکار کی طرف سے! (صدق - ۱۷ ۱۲/۴۸)

---

(۱۲) - "نئی دہلی - ۳ دسمبر - آج دستوری اسمبلی میں جب حقوق مذہب زیر بحث تھے تو ایک ممبر مسٹر تجمل حسین نے یہ عجیب و غریب تجویز پیش کی کہ آئندہ سے اس ملک میں کوئی شخص نہ ایسا لباس پہنے۔ نہ ایسا نام رکھے، نہ ایسی وضع قطع اختیار کرے جس سے اس کے مذہب کا پتہ چل سکے۔" (خبر)

یاد صرف اتنا کر لیجئے کہ اس تجویز کے اس "دو قومی نظریہ" کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے والی تجویز کے پیش کرنے والے کوئی غیر مسلم نہیں، ایک ہندی مسلمان، صوبہ بہار کے مسلمان ہی تھے! ـــ خدا معلوم توجہ عالی صرف نام، وضع و لباس ہی تک کیوں رہی؟ کیوں نہ ارشاد ہو گیا کہ اپنے کو سرے سے کسی مذہب سے منسوب کرنے ہی کا شمار غداری میں ہو گا۔ (ایضاً)

---

(۱۳) پنڈت نہرو کا روزنامہ نیشنل ہیرلڈ ۹ دسمبر لکھتا ہے :۔

۶ دسمبر کی رات کو بلند شہر میں جمعیتہ العلماء کانفرنس کے جلسہ سے کوئی ۵ ہزار آدمی جن میں ہندو، سکھ، کانگرسی اور ہمدردان کانگرس شامل تھے، اٹھ کر چلے گئے۔ جلسہ کی صدارت حافظ محمد ابراہیم وزیر یو۔ پی کر رہے تھے۔ ناراضی تو عوام میں تقریروں کے فرقہ وارانہ لب و لہجہ کے خلاف تین دن سے برابر پھیل رہی تھی۔ یہ انتہا کو اس وقت پہنچی جب خبر ہوئی کہ مولانا مدنی صدر جمعیتہ العلماء نے کوئی تقریر مسجد میں کی جس میں انھوں نے مسلمانوں کو تاکید کی کہ وہ اپنے وضع و لباس میں مسلمان بنے رہیں اور مطمئن اور بے ہراس رہیں، جیسا کہ ان کے پیغمبر تن تنہا کافروں میں رہتے تھے۔ کانفرنس میں کشیدگی قائم رہی جو حافظ محمد ابراہیم اور مولوی شبیر احمد کی ٹھنڈی تقریروں سے بھی دور نہ ہوئی۔"

(۱۴) ۔ گاندھی نگر (اجلاس کانگرس) کا نقشہ الجمعیت کی زبانی:

"مختلف دروازوں کے نام اور مختلف دفاتر کے سائن بورڈ ہندی میں لکھے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں انگریزی آجاتی ہے، لیکن اردو کا کہیں نشان نظر نہیں آتا۔ . . . . یہ سب کچھ اس کانگرس میں ہوا جس کے صدر ٹنڈن جی نہیں ایک خاص کانگرسی بھگت ڈاکٹر سیتارامیہ تھے۔ اس کانگرس میں ہوا جس کے ڈائس پر بڑے سے بڑے ہندوستانی نواز پنڈت جواہر لال نہرو اور مسز نائیڈو اور سب سے بڑھ کر آقائے اردو مولانا ابوالکلام رونق افروز تھے۔ اور ہاں اس کانگرس میں ہوا جس کا مقصد گاندھی جی کے پیام اور کارناموں کو زندہ رکھنا تھا ـــــ غریب اردو کی دادرسی جب اس آخری عدالت اپیل میں بھی نہ ہوئی تو آخر اب وہ اپنا سر پھوڑنے کے لئے کونسا آستانہ تلاش کرے۔"

---

(۱۵) "ان مسلمانوں کو جن کے دماغ میں اب تک مسلم لیگی ذہنیت موجود ہے یہ چیلنج دینا چاہتا ہوں کہ آج ایک زبان اور ایک تہذیب کے خلاف جو کوششیں ہو رہی ہیں انھیں نہ تو ہم برداشت کریں گے اور نہ کامیاب ہونے دینگے۔ مسلمان بھائی یا دوسرے لوگ اگر اس دیس میں رہنا چاہتے ہیں تو انھیں ہندی کو راشٹر بھاشا بنانا ہوگا۔ انگریز کے راج میں جو اختلاف تھا ہم اسے باقی نہیں رہنے دینگے۔ لوگوں کو چاہیئے کہ پرانی باتوں کو بھول جائیں اور یہ محسوس کریں کہ انھیں بصرف اس دیس کی زبان بولنی ہوگی بلکہ جس طرح اس دیس کے لوگ رہتے ہیں اسی طرح رہنا ہوگا۔ متضاد اور مخالف تہذیبوں کیلئے ہمارے دیس میں اب کوئی جگہ نہیں۔" (مسٹر شکلا وزیر اعظم سی۔پی۔ بحوالہ ملاپ ۱۲/۲۸)

---

(۱۶) ۔ انڈین پارلیمنٹ کے اسپیکر مسٹر مولنکر نے کہا ہے۔

"ہم اس وقت سخت کشمکش میں مبتلا ہیں۔ اگر اس کشمکش کا نتیجہ یہ نکلے کہ کسی ایک فرقہ کی زبان اور تمدن تباہ ہو تو اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اقلیت کے فرقہ کی زبان اور تمدن کو تباہ ہو جانا چاہیئے۔"

پھر ارشاد ہے۔

رہا مشترکہ زبان کا مسئلہ۔ سو چونکہ اب برطانوی راج ختم ہو گیا ہے اور فرقہ دار ریاست بھی رخصت ہو گئی ہے اس لئے اقلیت کے فرقہ کو اس ضرورت کا احساس کرنا چاہیئے کہ وہ ایک بڑے خاندان کا ممبر ہے اور اسے اس بڑے خاندان میں اپنی ہستی کو ضم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔"

(بحوالہ الجمعیۃ ۔ دہلی)

ہاری رپورٹ (سندھ)

از "حارث"

کہتے ہیں کہ انسان کا خون چونکہ نمکین ہوتا ہے اس لئے یہ جس درندے کے منہ کو لگ جائے چھوٹتا نہیں۔ چار پاؤں پر چلنے والے درندوں کا تو پتہ نہیں، لیکن یہ حقیقت ہے کہ جب انسان کا خون، دو پاؤں پر چلنے والے درندے (انسان) کے منہ کو لگ جائے تو وہ فی الواقعہ نہیں چھوٹتا۔ تاریخ انسانیت پر غور کیجئے۔ یہ ایک طویل داستان ہے اسی خون آشامی کی۔ فطرت نے تمام انسانوں کو نفس واحدہ سے پیدا کیا تھا جس سے عملاً یہ بتانا مقصود تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے سب انسان برابر ہیں۔ لیکن انسان کی اس لذتِ خون آشامی نے انسان اور انسان میں ایسی تفریق پیدا کی کہ علم الحیات (Biology) کی ہزار شہادتوں کے باوجود، مختلف طبقات کے انسان کبھی "ایک خدا" کی مخلوق دکھائی نہیں دیتے۔ انسان کی فطری مساوات کی بنا پر ایک انسان کا کسی دوسرے انسان کو اپنا غلام و مطیع بنالینا کچھ آسان کام نہ تھا۔ اس لئے اس کے لئے مستبد انسانوں کو ہزار ابلیسی حربے تراشنے پڑے۔ ان حربوں کے انداز مختلف ہیں لیکن ان کی تہ میں اصول ہر جگہ اور ہر زمانہ میں ایک ہی کارفرما رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے لو اور جب انسان بھوکوں مرنے لگ جائے تو پھر اس سے جو جی میں آئے کرالو۔ قرآن کا پہلا ورق الٹئے۔ اس میں سب سے پہلا فقرہ ربوبیتِ خداوندی کی شہادت دیتا نظر آتا ہے (الحمد للہ رب العالمین)۔ رب کے معنی "پالنے والا" ہیں، لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ کسی شے کو ابتدا سے انتہا تک جن مراحل سے گذرنا ہو ان سب میں اس کی پرورش کا سامان مہیا کر دیا جائے۔ کائنات کے مختلف گوشوں پر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ ربوبیت خداوندی کے اسباب و وسائل اور سامانِ ذرائع کس طرح، کس نظم اور ترتیب کے ساتھ، چار سو بکھرے پڑے ہیں۔ سامانِ پرورش کا یہ عالمگیر نظام پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ زندگی کے لئے جن عناصر کی ضرورت ہے دایۂ فطرت نے انھیں ہر جگہ پہلے ہی سے مہیا کر رکھا ہے۔ ہوا کو دیکھئے کس طرح ساری فضا اس سے بھرپور ہے۔ سورج کی گرمی اور روشنی کو لیجئے کیسے بے ضرر و معاوضہ سب کو ملتی جا رہی ہے۔ پانی کو دیکھئے، اس کی بہم رسانی کے لئے کیا عمدہ انتظام موجود ہے۔ غذا کو دیکھئے، کس طرح بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی دودھ کے چشمے رواں ہو جاتے ہیں۔ بچپن سے آگے بڑھئے تو انسانی غذا کا ذریعہ زمین ہے،

آپ سمجھتے ہیں کہ جب زندگی کے ابتدائی مراحل میں پرورش کے تمام ذرائع و اسباب تمام انسانوں کے لئے یکساں طور پر مہیا کر دیئے گئے ہوں تو کیا عمر انسانی کے اس اگلے دور (یعنی بچپن کے بعد کی زندگی) میں ان ذرائع پر ایسی پابندیاں لگا دی جائیں گی کہ انسان محض زندہ رہنے کی خاطر مارا مارا پھرے اور پھر بھی سامانِ زیست مہیا نہ کر سکے؟ یہ خدا کی ربوبیتِ عامہ کے خلاف ہے۔ یہ اس کی رحمت کے منافی ہے۔ اسی لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ رزق کے زمینی ذخائر کسی انسان کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ ان کا دروازہ سب کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ سورۂ حم السجدہ میں ذالک رب العالمین (یہ ہے تمام جہانوں کا پرورش کرنے والا) کہہ کر فرمایا:۔

وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبرک فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام۔
سواء للسائلین۔ (۴۱/۱۰)

وہ خدا جس نے زمین کی سطح پر پہاڑ بنائے اور زمین میں برکت رکھ دی (کہ جتنا جی چاہے اس سے نکالتے جاؤ۔ اس کا ذخیرہ ختم ہی نہ ہونے پائے) اور اس کی فصلوں کا اندازہ مقرر کرایا۔ اور اس کی اس طرح تخلیق چار مراحل میں کی۔ یہ (زمین) ہر ضرورت مند کیلئے یکساں طور پر موجود ہے۔

جس طرح ہوا کا ذخیرہ ہر سانس لینے والے کے لئے یکساں طور پر کھلا ہے۔ جس طرح سورج کی روشنی ہر دیکھنے والے کے لئے مساوی حیثیت سے موجود ہے۔ جس طرح پانی کے چشمے اور ندیاں ہر پیاسے کے لئے بلا روک ٹوک جاری ہیں۔ اسی طرح زمین میں غذا کے ذخیرے ہر ضرورتمند کے لئے یکساں طور پر محفوظ ہیں۔ جو محنت کرے، اپنی ضرورت کے مطابق نکال لے۔ یہ دایۂ فطرت کا سامانِ پرورش ہے۔ یہ ربوبیتِ خداوندی کا خوانِ یغما ہے۔ والارض وضعھا للانام (۵۵/۱۰) زمین کو خدا نے نوعِ انسانی کے فائدے کے لئے بنایا ہے۔ جب تک انسان کی فطرت کو ابلیسانہ ہوس کاریوں اور خبیثانہ کام جوئیوں نے ملوث نہیں کیا، اس کے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ زمین پر بھی کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے۔ لیکن مستبد انسانوں کی ہوس خون آشامی نے اسے بھانپا کہ جب تک انسان کو بھوکا نہ مارا جائے یہ دوسرے انسان کا غلام نہیں بن سکتا۔ اس لئے انھوں نے اس کے رزق کے سرچشموں پر قبضہ کرنے کی ٹھانی۔ فضا کی پہنائیوں میں پھیلی ہوئی ہوا اور روشنی تو اس کے دستِ تطاول کی رسائی سے باہر تھی۔ اس لئے وہ تو محفوظ رہ گئی (اور کسی حد تک پانی بھی) لیکن زمین پر سانپ بن کر بیٹھ جانا تو اس کے لئے ممکن تھا۔ یہ اس نے کیا اور بڑے دھڑلے سے کیا۔ اور اس طرح اپنے جیسے انسان کو اپنے سامنے جھکایا۔ نظامِ انسانیت میں وہ دن شرفِ انسانیت کے لئے سب سے زیادہ منحوس اور ابلیسانہ فتحمندی کے لئے سب سے بڑھ کر مبارک تھا جب پہلے پہل کسی انسان نے زمین پر اپنی ملکیت کا دعوےٰ کیا۔ بس اُس دن سے اس زمین پر جو اس سے پہلے انسانیت کی پرورش کے لئے گہوارۂ جنت تھی، فساد کی بنیاد پڑی جس نے ہر طرف جہنم کے شعلے بھڑکا دیئے۔ بایں نمط کہ مظلوموں اور دردمندوں کے مسلسل آنسوؤں کی بارش کے باوجود وہ شعلے بڑھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ وما ھم بخارجین من النار۔

قرآن آیا اور اس نے اس جہنم کو پھر سے جنت میں بدلنے کے فطری طریق سے انسانوں کو آگاہ کیا اور

صاحبِ قرآن (علیہ التحیۃ والسلام) نے اپنے بے مثال عمل سے اس تبدیلی کو مشہود دُنیا کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن فخلف من بعد هم خلف، ان صاحبانِ علم وعمل کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہو گئے کہ اضاعوا الصلوٰۃ واتبعو الشھوات۔ انھوں نے فطرت کے نظام کو ضائع کر دیا اور اپنی ہوسناکیوں اور کامرانیوں کے پیچھے لگ گئے۔ فسوف یلقون غیا (۱۹/۵۹) فطرت کے اٹل قانون کے مطابق ملوکیت نے انھیں پھر سے گھیر لیا اور پھر وہ جنتِ ارضی جہنم سے بدل گئی۔ چنانچہ آج قرآن کے نام لینے والوں اور انہی اسلاف کے نام پر اپنے نام رکھنے والوں کی حالت یہ ہے کہ بڑے فخر وتکبر سے کہتے ہیں کہ "میں دس ہزار ایکڑ زمین کا مالک ہوں۔" اور "میں یہاں کا سب سے بڑا زمیندار ہوں۔" اور نہیں شرماتے کہ ان کے اس اعلان سے کس طرح انسانیت کی آنکھیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ ان "دس دس ہزار ایکڑ زمین کے مالکوں" کے ہاں انسانوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے، اگر آپ اس کی ایک جھلک دیکھنے کی تاب لا سکتے ہیں تو دور نہ جائیے۔ یہیں سندھ کے کسی گاؤں میں نکل جائیے اور وہاں دیکھئے کہ خدا کی جس مخلوق کو ہاری کہا جاتا ہے اس پر کیا قیامت گذر رہی ہے (یہ لفظ حارث، یعنی کاشتکار کی مسخ شدہ صورت ہے۔ یعنی ان بیچاروں کی صورت اور سیرت کے ساتھ اس لفظ کا بھی حلیہ بگڑ گیا ہے جس سے انھیں متعارف کیا جاتا ہے) گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ اور سردیوں کے کپکپاتے جاڑے میں شب وروز کام کرنے والا یہ مزارع، ایک چلتی پھرتی مشین دکھائی دیگا جس کی حالت یہ ہے کہ اگر کُرتا ہے تو تہمد نہیں اور تہمد ہے تو کُرتا نہیں۔ ایک خستہ وخراب جھونپڑا (جو کہ مویشیوں اور انسانوں کا مشترکہ مسکن ہوتا ہے) اور اس میں چند مٹی کے برتن، دو تین کھاٹ، اور کچھ پھٹے پرانے لحاف۔ یہ ہے اس کی کل کائنات۔ وہ ہر وقت زمیندار کے خوف سے لرزاں وترساں رہتا ہے کہ نہ جانے اس کا مزاجِ شاہانہ کس بات پر برہم ہو جائے اور اس بیچارے کو اس کی کھڑی فصل سے کان پکڑ کر باہر نکال دے۔ فصل پکنے پر سب کی سب زمیندار کے کھلیانوں میں جا پہنچتی ہے اور وہاں وہ اپنے اور اپنے آباؤ اجداد کے بتائے ہوئے قاعدوں کے مطابق اس کی بٹائی کرتا ہے جس میں

از صحن خانہ تا بہ لبِ بام از آنِ من　　از بامِ خانہ تا بہ ثریا از آنِ تو

کا اصول ہر مقام پر جاری وساری نظر آتا ہے۔ اگر ہاری بیچارا کسی بات پر بھی زبان کھولے تو دوسرے دن حوالات میں نظر آتا ہے۔ گاؤں زمیندار کا ہے۔ گاؤں والے زمیندار کے ہیں۔ پولیس زمیندار کی ہے۔ قانون زمیندار کا ہے۔ عدالت زمیندار کی ہے۔ اور فسادِ آدمیت کے ان متنوع زنجیروں میں جکڑا ہوا مظلوم ومقہور اور مجبور ومجہول ہاری، ازمنۂ مظلمہ کے عہدِ غلامی کی زندہ تصویر آپ کے سامنے۔ چونکہ یہ خود زمیندار کا مملوک ہے اس لئے اس کی ہر شے زمیندار کی ملک ہے۔ نہ صرف اس کی محنت ومزدوری کا ماحصل ہی بلکہ اس کی عزت و آبرو بھی۔ نہ کسی غریب کی بہو اور بیٹی کی ناموس محفوظ ہوتی ہے نہ بہن اور بیوی کی عصمت۔ ان مظلوموں کی متاع ملک کا خون، زمیندار کے عشرت کدہ کے لئے سامانِ زینت بنتا ہے۔ اگر کسی کی غیرت نے ذرا بھی مداخلت کی تو پھر اس کے بعد دنیا نے اس کی صورت کبھی نہیں دیکھی۔ یہ افسانے نہیں، حقیقتیں ہیں اور یہیں آپ کے

گرد و نواح تڑپتی اور پھڑکتی نظر آرہی ہیں۔

شروع ۱۹۴۷ء میں جب سندھ اسمبلی کے الیکشن کے بعد، وزارت کے جھگڑے میں کھوڑو اور غلام حسین (مرحوم) مابین رسہ کشی شروع ہوئی ہے تو محترم قائد اعظم سندھ میں تشریف فرما تھے۔ عین اسی زمانہ میں یہ خبر خاص حلقوں میں چکر لگا رہی تھی کہ سندھ کے زمینداروں کے مظالم و استبداد کی انسانیت کش داستانیں محترم قائد اعظم تک پہنچی ہیں، جن سے متاثر ہو کر انھوں نے چاہا ہے کہ حقیقتِ حال کی تحقیق و تفتیش کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ چنانچہ سندھ اسمبلی کی سفارش کے مطابق مارچ ۱۹۴۷ء میں "ہاری کمیٹی" کا وجود عمل میں آیا۔ کمیٹی کے صدر، سر راجر ٹامس تھے جو ایک مدت سے سندھ کے وزیر زراعت (بلا تنخواہ) چلے آرہے تھے اور جو سندھ کے ضلع میرپور خاص میں خود وسیع اراضی کے مالک ہیں۔ اس کے ایک ممبر مسٹر صدیقی (عیسائی) سندھ پبلک سروس کمیشن کے رکن اور دوسرے ممبر، نواب شاہ کے کلکٹر، مسٹر مسعود (آئی۔ سی۔ ایس) تھے۔ سر راجر اور صدیقی صاحب تک کی بات تو قابلِ فہم تھی لیکن مسٹر مسعود کی رکنیت کی رسم ارباب فکر و نظر میں سے کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اس لئے کہ وہ جانتے تھے کہ مسعود جیسے قرآنی مسلمان اور سر راجر جیسے قارونی زمیندار کا ساتھ آگ اور پانی کا میل ہے جو کبھی نبھ نہیں سکتا۔ لہٰذا اس کمیٹی کی تعمیر میں ہی خرابی کی صورت مضمر تھی۔ لعد میں معلوم ہوا کہ ہاریوں کی مظلومیت کی داستان مسعود صاحب کے ذریعہ ہی محترم قائد اعظم تک پہنچی تھیں اور اسی کے دل کی دھڑکنیں اس اقدام کی محرک ہوئی تھیں۔

مسعود کو دنیا ایک آئی۔ سی۔ ایس افسر کی حیثیت سے ہی جانتی ہے لیکن راقم الحروف اس سنگین حصار کے اندر چھپے ہوئے اس چشمۂ صاف و شیریں سے بھی واقف ہے جسے ایک مسلم نوجوان کا قلبِ مصفا کہا جاتا ہے۔ جو ہر مظلوم کی مصیبت پر تڑپتا اور ہر ظالم کے جور و استبداد پر بھڑکتا ہے۔ مسعود کو زمانہ طالب علمی ہی سے قرآن سے ذوق تھا۔ عربی میں اس کی استعداد اپنے ہم دبستانوں سے بہت آگے تھی۔ قانون کے امتحان (ایل ایل بی) میں وہ پنجاب بھر میں اول نمبر پر آیا۔ (بلکہ اس نے ریکارڈ قائم کیا)۔ اُس زمانہ میں ہی اس کی حالت یہ تھی کہ وہ گاؤں گاؤں۔ شہر بہ شہر پھرتا اور مسلمانوں کو عزت و شوکت اور دیانت و امانت کی صحیح اسلامی زندگی کی دعوت دیتا، راستہ چلتے جو کچھ مل جاتا کھا لیتا اور جہاں رات آتی وہیں زمین پر سو جاتا۔ یہ تھا دیوانگی اور فرزانگی کا وہ مجسمہ، مسعود، جو بعد میں آئی۔ سی۔ ایس کا افسر بنا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ملازمت کی پابندیاں بڑی حد تک ان عزائم کی راہ میں عناں گیر ہو جاتی ہیں جو اس قسم کے دل و دماغ رکھنے والے نوجوان کے دل میں موجزن ہوتے ہیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ

پری نہفتہ رخ و دیو در کرشمہ و ناز ... پری رُد تابِ مستوری ندارند ... چو در بندی ز روزن سر بر آرند

چڑھتی ہوئی ندیوں کو اگر بڑھنے سے روک دیا جائے تو وہ کنوؤں اور چشموں کے راستے سر نکال لیتی ہیں۔ حکومتِ بمبئی نے مسٹر مسعود کو ۱۹۴۲ء میں، خاندیش میں بھیلوں کے اصلاح کے کام پر متعین کر دیا۔ گونڈ اور بھیل

اور اسی قسم کے دیگر "وحشی قبائل" درحقیقت اس جور و قہرِ انسانیت کی زندہ یادگار ہیں جو ہندوؤں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں یہاں کے اصل باشندوں پر روا رکھا تھا۔ ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک مسلمان نوجوان جس کے دل و دماغ کی تعمیر صحیح قرآنی اصولوں پر ہوئی تھی، ان کی خون رلا دینے والی حالت کو دیکھتا اور اس کا قلب حساس، ان کی مظلومیت کے درد و اندوہ سے پگھل نہ جاتا۔ تین سال میں مسعود نے وہاں جو کام کیا وہ اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ اگر کرنا چاہے تو **ایک مسلمان** تنہا بھی کیا کچھ کر سکتا ہے۔ چونکہ یہ داستان بڑی دلچسپ اور موعظت آمیز ہے اس لئے اسے ہم ذرا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ مقصود اس سے مسٹر مسعود کی مدحت سرائی نہیں بلکہ اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ ایک درد رکھنے والا مسلمان مجبوریوں کے باوجود کیا کچھ کر سکتا ہے۔

بھیلوں کو مذہبی شعور نہ تھا اور وہ قدیمی رسومات کو زندگی کے لئے کافی سمجھتے تھے۔ ہندو مہاسبھا اور کانگریس نے ۳۰ - ۴۰ سال کی متواتر کوششوں سے بھیلوں کو ہندومت میں داخل کیا اور یہ لوگ اپنے آپ کو ہندو کہلانے لگے۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے متعلق پہلے اچھے جذبات تھے لیکن اب ہندو اثر کے ماتحت یہ لوگ مسلمانوں کے سخت دشمن ہو گئے اور انھوں نے خاندیس کے علاقہ میں سینکڑوں مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ یہ واقعات ۱۹۴۲ء کے تھے۔ ان حالات میں حکومت بمبئی نے مسٹر مسعود کو بھیلوں کی اصلاح کے لئے منتخب کیا۔ بھیلوں کی سرکشی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ انھوں نے افسروں تک کو بھی قتل کر دیا تھا اور انگریزوں کی ابتدائی تاریخ میں انھوں نے انگریزی افواج کا خوب ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا۔

اس فضا میں جو کام مسٹر مسعود کے لئے تجویز کیا گیا وہ سخت مشکل اور خطرناک تھا۔ لیکن تین سال کی شبانہ روز محنت اور انتھک مخلصانہ کوششوں سے مسعود نے بھیلوں کو اپنایا اور اپنی حسن کارگذاری اور بے لوث خدمت سے غریب بھیلوں کو اقتصادی زبوں حالی سے نجات دلائی۔ ہندو ساہوکاروں کا قلع قمع کیا۔ افسروں کی بیجا بیگار اور ظلم سے خلاصی دلائی۔ اور ان کی ہر نکالیف کا فوری علاج کیا۔ طبی امداد کا اور سکولوں کا جا بجا اجرا کرایا۔ اس مقصد کے لئے مسٹر مسعود نے بھیلوں کے قدیمی کلچر اور زبان سے پوری واقفیت پیدا کی اور ان کے دیوتاؤں کی روایات اور رسومات اور پسندیدہ باتوں پر پورا عبور حاصل کیا۔ یہ کچھ آسان کام نہیں تھا، لیکن اس کے بغیر کام ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ان کی زبان اور معاشرت سے آگہی حاصل کرنے کے بعد مسٹر مسعود نے اپنی طرزِ معاشرت کو بالکل بدل کر تمام غریب بھیلوں کی معاشرت شروع کر دی۔ وہ انہی میں رہتے سہتے اور ان کی خدمت کے لئے بڑے بڑے دشوار اور مخدوش جنگلوں کو ۲۰ - ۲۰ - ۳۰ - ۳۰ میل پیدل قطع کر کے ایک ایک کونہ اور گوشے میں پہنچتے۔ بیماروں کی تیمارداری اپنے ہاتھوں سے کرتے اور سامان خوراک، عام ضروریات کی چیزیں اور دوائیں وغیرہ ان مفلوک الحال مریضوں کو بھیجا کرتے۔ ان باتوں نے بھیل اقوام کو ان کا گرویدہ بنا دیا اور تمام قوم ان کے پیچھے لگ گئی حتیٰ کہ انھیں مسعود مہاراج اور مسعود بھگوان کے نام سے پکارنے لگی اور لاکھوں کی تعداد میں بھیل ان کے جاں نثار بن گئے۔

ابتدائی مراحل کامیابی کے ساتھ طے کرنے کے بعد مسٹر مسعود نے بھیلوں کے جداگانہ تشخص کی تحریک کی بنیاد ڈالی۔ اس تحریک کا مقصد بھیلوں کو ان کا معیارِ زندگی بلند کر کے ابھارنا تھا۔ ہندو مت میں داخل ہو جانے سے بھیلوں کے دل میں احساس کمتری بہت شدت کے ساتھ گھر کر گیا تھا اور وہ اپنے آپ کو بہت نیچا سمجھنے لگ گئے تھے اور ہندوستان نے انھیں نیچ قوموں کا درجہ دیدیا تھا۔ یہ خطرہ محسوس کر کے کہ بھیل لوگ بھی ہندو مت کا شکار رہنے کے بعد اچھوت قوم میں داخل ہو جائیں گے۔ اور اس قعرِ مذلت سے ان غریبوں کو بچانا لازمی ہے۔ مسٹر مسعود نے بھیل قومیت کی تحریک کی بنیاد رکھی اور ایک بھیل قومی ترانہ بنایا جس کے یہ الفاظ تھے:۔

"ہم بھیل بہادر بھیل جنگلوں کے راجہ شیروں کے بچے۔ نہ ہم کسی سے کم۔ ہم سب سے اونچے"

یہ قومی ترانہ بہت جلد بھیلوں میں مقبول ہو گیا۔ حتیٰ کہ بچے بوڑھے جوان سب یہ ترانہ گانے لگے اور ان کے ساتھ ہی "بھیل بھومی کی جے" کا نعرہ بھی بلند ہوا۔ بھیل قوم میں بیداری کی ایک عام لہر دوڑ گئی۔ کانگریس اور مہا سبھا نے بھیلوں کے علاقہ میں چار پانچ سو سکول کھول رکھے تھے جن میں بھیل بچوں کو ہندو مت کی تعلیم دی جاتی تھی اور بندے ماترم کے گانے گائے جاتے تھے۔ بھیل قومی ترانہ جو بھیلی زبان میں تھا اس زور شور سے پھیلا کہ اس نے بندے ماترم اور دوسرے ہندو گانوں کو بھیلوں کے دماغ سے نکال باہر کیا۔ اور بھیلوں میں قومی شعور کے ماتحت ہندو سرمایہ دار کے خلاف نفرت پھیل گئی۔ ہندو ساہوکاروں نے مدت دراز سے پنجے پھیلائے ہوئے تھے اور بھیلوں کو اپنی اقتصادی غلامی میں جکڑ رکھا تھا بھیلوں کی تقریباً آدھی زمینیں ساہوکاروں کے قبضہ میں جا چکی تھیں۔ قومی تحریک کا لازمی نتیجہ تھا کہ بھیل ہندو سرمایہ داروں کے برخلاف کھڑے ہو جاویں۔ چنانچہ یہی ہوا اور ہزاروں کی تعداد میں ہندو ساہوکار ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ قومی تحریک آگ کی طرح سارے ملک میں پھیل گئی۔ اور ہندوؤں اور بھیلوں میں مختلف مقامات پر تصادم ہوا۔ اس وقت کانگریس اور ہندو مہا سبھا نے مسٹر مسعود کے برخلاف سارے بمبئی کے پریس میں زبردست ہنگامہ برپا کر دیا۔ متواتر چار مہینے تک اخبارات میں بڑی بڑی جلی سرخیوں کے ساتھ مختلف مضامین مسٹر مسعود کے برخلاف شائع ہوئے اور سارے پریس نے بڑی شد و مد کے ساتھ مطالبہ کیا کہ حکومت مسٹر مسعود کو تبدیل کر کے ان کے برخلاف انکوائری کرے اور نوکری سے معطل کرے۔ ایسا بلا خیز ہنگامہ آج تک کسی سیاسی لیڈر کے برخلاف بھی اخبارات میں نہ ہوا تھا۔ مسٹر مسعود کے خلاف فہرست الزامات میں سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ وہ بھیلوں کو ہندو مت سے نکال کر اسلام میں لے جا رہے ہیں۔ کانگریس کے بڑے بڑے زعماء نے بھی اس معاملہ میں دخل دیا اور گورنر بمبئی سر جان کاتیل کو مسٹر مسعود کے برخلاف بہت کچھ بڑبڑایا اور کہا سنا۔ حکومت کو مسٹر مسعود کے کام سے پوری واقفیت تھی۔ مسٹر مسعود نے اپنی صداقت کا ثبوت دینے کیلئے یہ خواہش ظاہر کی کہ اگر کانگریس ان کے ساتھ زور آزمائی کرنا چاہتی ہے تو بھیلوں کے علاقہ میں مسٹر گاندھی کو ان کے خلاف الیکشن میں لایا جاوے، اگر وہ ایک کے مقابلہ میں دس کے فرق سے

گاندھی کو نہ ہرا دیں تو حکومت بمبئی انھیں نوکری سے علیحدہ کر دیوے۔ مسٹر مسعود کی یہ تحریر حکومت بمبئی کے پاس پہنچ گئی۔ گورنر صاحب نے اس کی نوبت نہ آنے دی اور مسٹر مسعود کو بلا کر کہا کہ وہ ان کے کام سے بخوبی واقف ہیں اور دیکھ چکے ہیں کہ لاکھوں کی تعداد میں بھیل ان کے پیچھے ہیں، کسی مزید ثبوت کی ضرورت نہیں۔ بالآخر حکومت بمبئی نے مسٹر مسعود کی حمایت میں ایک پریس نوٹ شائع کیا جس میں تمام الزامات کی تردید، مسٹر مسعود کے کام کی تعریف اور ان میں حکومت کے کامل اعتماد کا اظہار تھا۔

کانگریس کا پریس جو مسٹر مسعود کی معطلی کے احکام کا سخت مطالبہ کر رہا تھا۔ اس نوٹ سے نہایت خفیف ہوا۔ ہندو مہاسبھا نے پونہ سے اور پروونشل کانگریس کمیٹی نے مقام بلدپور سے زبردست ریزولیوشن پاس کئے اور مسٹر مسعود کی نوکری سے برخواستگی کا مطالبہ کیا۔ لیکن گورنمنٹ کے پریس نوٹ کی وجہ سے انھیں سخت منہ کی کھانی پڑی۔ اب حکومت کے اس پریس نوٹ کے خلاف کانگریس کے اخبارات نے شور مچایا ہر ایک اخبار کے پہلے صفحہ پر روزانہ ایک سرخی شائع ہوتی کہ کانگریس حکومت جب برسر اقتدار آئے تو سب سے پہلے مسعود کے معاملہ کی تحقیق کرے اور بمبئی کے گورنری نوٹ کو منسوخ کرے۔ یہ واقعات اکتوبر نومبر ۱۹۴۵ء میں رونما ہوئے۔ مارچ ۱۹۴۶ء میں کانگریسی حکومتوں کے آنے کی خبر اڑی۔ اس وقت گورنر بمبئی نے مسٹر مسعود کو بلا کر کہا کہ ان کا تبادلہ صوبہ سندھ کیا جا رہا ہے۔ مسٹر مسعود نے اظہار ناراضگی کیا لیکن گورنر نے کہا کہ انھیں معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پٹیل نے کانگریسی وزیر اعظم کھیر کو خاص ہدایت کی ہے کہ جونہی وہ قلمدان وزارت سنبھالے مسٹر مسعود کے معاملہ کو از سر نو اٹھاوے۔ گورنر کو سخت تشویش تھی کہ ایسا ہونے سے ایک آئینی تعطل کا خطرہ پیدا ہو جاویگا اور ان کی پوزیشن سخت کشمکش میں پڑ جائے گی۔ کیونکہ وہ اپنے پریس نوٹ میں مسٹر مسعود کو حق بجانب قرار دے چکے تھے۔ اور اب کانگریس نے اگر پھر معاملہ اٹھایا تو ان کے پہلے پریس نوٹ کے خلاف ان کو فیصلہ دینے پر کانگریسی وزارت مجبور کریگی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وزارت اور گورنر میں اختلاف پیدا ہوگا۔ لہذا یہی مناسب سمجھا گیا کہ مسٹر مسعود سندھ چلے جائیں۔ ۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء کو مسٹر مسعود نے حکومت بمبئی کو خیرباد کہا اور ۲ اپریل ۱۹۴۶ء کو وہاں کانگریسی حکومت قائم ہوگئی۔

بھیل قومیت کی تحریک سے بھیلوں اور ہندوؤں کے تصادم کا نتیجہ یہ ہوا کہ بھیلوں نے مسلمانوں کی پناہ لی۔ اور ہندوؤں سے اس قدر بیزار ہوئے کہ ان کا سب سے بڑا لیڈر روما لعل جی کا دت جب سخت بیمار ہوا اور اس کے عزیزوں نے ہندو ڈاکٹروں کو بلانا چاہا تو اس نے کہا "مجھے ہندو ڈاکٹر نہیں چاہئیں وہ مجھے زہر دیکر مار ڈالیں گے۔ کوئی مسلمان حکیم بلا لو"۔

مختصر یہ کہ اس تین سال کے عرصہ میں مسٹر مسعود نے ایک ایسا انقلاب پیدا کر دیا جس کا اعتراف خود ہندوؤں کو بھی کرنا پڑا۔ چنانچہ ۱۱ نومبر ۱۹۴۵ء کے السٹریٹڈ ویکلی (بمبئی) میں مسٹر ایم کرشنا نے بھیلوں کے اس انقلاب کی تفصیلی داستان کی ابتدا ان الفاظ سے کی۔

یہ داستان ہے اس معاشی، معاشرتی معجزہ کی جس نے بھیلوں جیسی مظلوم، بے کس و بے بس، قابلِ رحم، جور و استبداد کے ہاتھوں مٹی ہوئی قوم کو "واجب العزت" قابلِ فخر اور خود آگاہ انسانوں کا گروہ بنا دیا۔ ایسے انسانوں کا گروہ جو اب اپنے قبائلی کلچر اور روایات کو قابلِ شرم محسوس نہیں کرتے۔ جنھوں نے اپنی گم گشتہ روح کو پھر سے پا لیا ہے اور جو اب اپنی ترقی کی شاہراہ پر نہایت عزم و استقلال سے گامزن ہو رہے ہیں۔ جس آدمی کے ہاتھوں یہ معجزہ عمل میں آیا ہے وہ مسٹر محمد مسعود آئی سی ایس ہے جسے بھیل "مسعود مہاراج" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کا نام آج تین لاکھ بھیلوں کے ہر ایک گھر میں گونجتا اور ان کے گیتوں اور نعروں میں گرجتا ہے۔

ہم اس تفصیلی داستان کے تذکرہ سے معذرت چاہتے ہیں لیکن اس کے بعد آپ یقیناً ہم سے متفق ہوں گے کہ ایک مخلص مسلمان مجبوریوں کے باوجود کیا کچھ کر سکتا ہے۔ یہ تذکرہ اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ اس پس منظر کے بغیر یہ بات بآسانی سمجھ میں نہیں آسکے گی کہ ہاری کمیٹی میں مسعود صاحب نے کیا کیا اور اب حکومت نے جو کچھ ان کی رپورٹ کا حشر کیا اس کی وجہ کیا ہے!

اس کارگزاری کے ساتھ مسٹر مسعود سندھ آئے اور نواب شاہ کے کلکٹر مقرر ہوئے۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد سندھ میں الیکشن کا ہنگامہ گرم ہونے والا تھا۔ یہ الیکشن کوئی معمولی الیکشن نہ تھا۔ یہ وہ الیکشن تھا جس پر پاکستان کے مطالبہ کی فتح و شکست کا دارومدار تھا۔ نواب شاہ، مسٹر سید اور ان کی پارٹی کا حصنِ حصین تھا۔ اس قلعہ کا توڑنا بہت ضروری تھا۔ مسٹر مسعود کے سامنے ایک طرف ملازمت کی پابندیاں تھیں اور دوسری طرف مسلمانوں (بلکہ اسلام) کے مستقبل کا سوال۔ مسعود کا فیصلہ ظاہر تھا۔ اس کے بعد اس گرمجوش نوجوان نے کیا کچھ کیا اس کے متعلق ہم سے نہیں، سندھ کے ہندو پریس سے پوچھئے۔ سندھ آبزرور نے اپنے مقالہ افتتاحیہ میں جھلا کر یہاں تک لکھ دیا کہ

> مسلم لیگ کی حمایت کے سلسلہ میں مسٹر مسعود کے خلاف جو کچھ پریس میں شائع ہو رہا ہے اگر اس کا عشر عشیر بھی صحیح ہے تو نہ صرف یہ کہ اس افسر کو فوراً نواب شاہ سے تبدیل کر دینا چاہئے بلکہ اس کے خلاف جوڈیشنل انکوائری شروع کرنی چاہئے اور جرم ثابت ہونے کی صورت میں اسے ملازمت سے برطرف کر دینا چاہئے۔ (سندھ آبزرور مورخہ ۱۳ جنوری)

بہرحال لیگ کے مخالفوں کو شکست ہوئی اور اس سرزمین پر جسے باب الاسلام ہونے کا شرف حاصل تھا، پاکستان کا جھنڈا گڑ گیا۔

بھیلوں کی تحریک اور مسلم لیگ کی حمایت کی بنا پر ہندوؤں کے دل میں مسٹر مسعود کے خلاف کس قدر آتشِ انتقام شعلہ زن تھی اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ تقسیم ہندوستان کے بعد جب ہندو اپنی منظم اسکیم کے ماتحت سندھ سے عازمِ ہندوستان ہوئے ہیں تو مسٹر مسعود نواب شاہ کے کلکٹر تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص

غیر مسلم بھیلوں کی خدمت میں خون پسینا ایک کردے، وہ سندھ کے ہندوؤں کے ساتھ کس طرح ظلم روا رکھ سکتا ہے۔ ایک مسلمان کے ہاتھ سے ظلم ناممکن ہے کہ اس کا خدا اسے دشمن سے بھی عدل کرنے کی تاکید کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ہندو پریس میں مسٹر مسعود کے خلاف ایک کہرام مچا دیا جاتا ہے حتیٰ کہ مسٹر گابا اپنی رسوائے عالم کتاب . . . (Inside Pakistan) میں ضلع نواب شاہ میں مظالم کے بہت سے فرضی افسانے درج کرنے کے بعد لکھتا ہے کہ یہ اسی مسعود کے کارنامے تھے جو "اپنی بدنظمی کے لئے ایک مدت سے بدنام چلا آرہا ہے" (ص ۲۳۸)۔ حتیٰ کہ مسٹر گاندھی نے ایک شام اپنی پرارتھنا میں بھی مسٹر مسعود کو سندھ کے فسادات کا ذمہ دار ٹھہرایا تھا۔ اور پروفیسر ملکانی ڈپٹی ہائی کمشنر انڈیا متعینہ پاکستان نے یہاں تک لکھ دیا کہ "کلکٹر نواب شاہ کا نام بطور ایک خوفناک بھوت کے لوک گیتوں میں مشہور ہوجائے گا اور آنے والی نسلیں اس نام سے اپنے بچوں کو ڈرایا کریں گی" (سندھ آبزرور ۱۲ پٹ)

یہ سب بھیلوں کی تحریک اور پاکستان کی حمایت کی بنا، پر ہندو ذہنیت کے جذباتِ غیظ و غضب کے مظاہرے تھے۔ لیکن لیگ کا کام ایک وقتی کام تھا۔ مسٹر مسعود کے سامنے یہاں پھر ظلم و مظلومیت کی ایک انسانیت سوز کشمکش تھی جو زمیندار اور ہاری کی شکل میں وجہِ ننگِ آدمیت تھی۔ ہاریوں کی مظلومیت بھیلوں سے کہیں کم نہ تھی اس لئے ہو نہیں سکتا تھا کہ مسعود ان کے اس زبوں حالی کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور اس کا دل تڑپ نہ اٹھتا۔ اس نے اپنے کلکٹری کے زمانہ میں ان غریبوں کی ہمدردی میں کیا کچھ کیا اس کی تفصیل ضلع نواب شاہ کے کسی ہاری سے سنئے۔ خاندیس میں بھیلوں کے تباہ کرنے والے ہندو سرمایہ دار تھے۔ اور جہاں حالت یہ تھی کہ ہاریوں کا خون چوسنے والے خود مسلمان سرمایہ دار۔ لہٰذا یہاں کام مشکل بھی تھا اور بڑی حد تک خطرناک بھی۔ لیکن مسٹر مسعود نے اپنی بے لوث ہمدردیوں سے یہاں بھی مظلوم ہاریوں کے دل میں گھر کر لیا۔

بہرحال یہ تھے مسٹر مسعود آئی۔ سی۔ ایس۔ جو ہاری کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور جنہیں سر راجر ٹامس کی زیرِ صدارت، زمینداروں کی دراز دستیوں کے خلاف ہاریوں کی فریادرسی کا فریضہ سونپا گیا۔ نتیجہ ظاہر ہے! شروع شروع میں (سنا ہے کہ) مسٹر صدیقی نے مسعود صاحب کا ساتھ دیا اور اس طرح صاحب صدر کو اپنے خیالات سونپنے میں ناکامی ہوئی۔ اس طرح آٹھ مہینے گذر گئے اور جب سر راجر کو محسوس ہونے لگا کہ اکثریت کی رپورٹ ان کے خیالات کی موید نہیں ہوسکے گی تو مسٹر کھوڑو کے حکم سے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں ایک چوتھے ممبر (مسٹر غلام رسول کہر) کمیٹی کے ساتھ چپکا دیئے گئے۔ یہ صاحب ضلع لاڑکانہ کے ایک بہت بڑے زمیندار ہیں۔ ان کے اضافہ سے سر راجر کو بڑی تقویت ملی اور ان کے متحدہ محاذ نے ایسا زور پکڑا کہ مسٹر صدیقی بھی اس کے حریف نہ ہوسکے۔ اب مسٹر مسعود اقلیت میں رہ گئے۔ ہم نے سنا یہ ہے کہ سر راجر، کمیٹی کی دوسری یا تیسری نشست میں ہی، ایک رپورٹ مرتب کرلائے تھے یہی رپورٹ، بادنیٰ تغیر و تبدل، اس طرح حاصل کردہ اکثریت کے زور پر منظور کرالی گئی۔ فروری ۱۹۴۸ء میں یہ رپورٹ حکومت کو بھیجدی گئی۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مسٹر مسعود اس رپورٹ کے حامیوں میں سے کیسے ہوسکتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے رپورٹ پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ اس دوران میں بہت سی اڑتی ہوئی خبریں فضا میں پھیلتی رہیں کہ

کس طرح مسٹر مسعود پر دباؤ ڈالا جارہا ہے کہ وہ سر آجر کی ہاں میں ہاں ملادے لیکن مسعود کو نہ ماننا تھا اور وہ نہ مانا۔ ایسے نامساعد حالات میں مسٹر مسعود نے اپنی "اقلیت رپورٹ" مرتب کی جسے غالباً مئی یا جون میں حکومت تک پہنچا دیا۔ آئینِ جمہوریت کی رُو سے، اقلیت کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ اکثریت کے فیصلہ کے خلاف اپنی آواز اٹھائے اور اگرچہ فیصلہ اکثریت ہی کی رائے کے مطابق ہوتا ہے لیکن اقلیت کی اس آواز کو دنیا کے سامنے پیش کردیا جاتا ہے۔ لیکن حکومتِ سندھ نے جمہوریت کے اس مسلّمہ آئین کو پائے استکبار سے ٹھکرا دیا اور اکثریت رپورٹ تو شائع کردی لیکن مسٹر مسعود کی رپورٹ کو دبالیا۔ یہ کچھ ۱۹۴۹ء میں ساری مہذب دنیا کے علی الرغم کیا گیا ہے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ مسٹر مسعود کی اختلافی رپورٹ میں کیا لکھا ہے لیکن قرائن سے اس کے متعلق قیاس لگانے میں چنداں مشکل نہیں۔ مسٹر مسعود کا قلبی احساس اور ذہنی افتاد ہمارے سامنے ہے۔ ان کی زندگی کے سابقہ رجحانات اور ان کے علمی تجارب کے کچھ نقوش بھی گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں (آپ نے اب محسوس کیا ہوگا کہ ہم نے مسٹر مسعود کے سابقہ زندگی کے احوال و کوائف کا بیان کیوں ضروری سمجھا تھا)۔ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ ہاریوں اور زمینداروں کے حالات کے متعلق مسٹر مسعود کو براہِ راست معلومات حاصل ہیں اس لئے کہ وہ ایک عرصہ تک اندرونِ سندھ میں بہ حیثیت کلکٹر کام کرتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ مہاجرین کے بسانے کے کام پر مامور ہیں اور وہ جانتے ہیں کہ سندھ کا زمینداری نظام، اس مسئلہ کو کس طرح لاینحل بنا رہا ہے۔ ان حالات کی موجودگی میں مسٹر مسعود کی اختلافی رپورٹ کے متعلق صحیح اندازہ لگانے کے لئے کسی افلاطون کی عقل کی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس رپورٹ میں ہاریوں کی مظلومیت اور زمینداروں کے کابوسیانہ پنجۂ استبداد کی گلوگیریوں کو بے نقاب کیا گیا اور قرآن اور حکمت کے نصوص و شواہد سے زمین پر انفرادی اور شخصی ملکیت کا عدم جواز ثابت کیا گیا ہوگا۔ (کہ جس مسعود سے راقم الحروف اس کے زمانۂ طالب العلمی سے واقف ہے اس سے اس کے سوا کچھ اور توقع ہی نہیں کی جاسکتی)۔ لہٰذا ہمارے نزدیک یہ مسئلہ مسعود اور سر آجر، ٹامس یا حکومتِ سندھ کا مسئلہ نہیں۔ یہ مسئلہ وہی ہے جو ہابیل اور قابیل کے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ یہ صدائے بازگشت ہے، اس داستانِ کہن کی کہ جب ساحرینِ دربارِ فرعون نے حقیقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے بے نقاب دیکھ کر کہہ دیا کہ اٰمنا برب العالمین۔ ہم خدائے رب العالمین پر ایمان لاتے ہیں تو فرعون ایک بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرجا اور کف بدہاں سیلاب کی طرح امڈا اور قہرمانیت کی برقِ خاطف کی سی گرج کے ساتھ چلایا کہ اٰمنتم بہ قبل ان اٰذن لکم۔ میری اجازت کے بغیر تم ایمان لارہے ہو؟ جانتے ہو اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ لاقطعن ایدیکم وارجلکم من خلاف ثم لاصلبنکم اجمعین (۷/۱۲۴) میں پہلے تمہارے ہاتھ پاؤں الٹے سیدھے کٹواؤں گا اور پھر سب کو سولی پر لٹکا دوں گا۔ ولتعلمن اینا اشد عذابا و ابقی۔ اس وقت تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم دونوں میں کس کا عذاب زیادہ شدید اور دیرپا ہے۔ اس طرح وہ قہرمانیت اور حق گوئی اور بے باکی کی وہی ازلی آویزش جو وہاں فرعون اور ساحرین کی کشمکش کی صورت میں متشکل ہوئی تھی، یہاں اربابِ اقتدارِ سندھ اور مسعود کی آویزش کی شکل میں مشہود ہوئی ہے۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے
وہی فطرتِ اسداللّٰہی ۔ وہی مرحبی وہی عنتری

واضح رہے کہ مسعود سے ہماری مراد شمس الاطبا حکیم غلام جیلانی کے خلف الصدق اور سندھ کے آئی ۔ سی ۔ ایس افسر سے نہیں بلکہ مفہوم ہے حق وصداقت کی اس آواز سے جو مظلوم انسانیت کے دکھ سے متألم ہو کر ایک نوجوان مسلم کے سینہ میں برقِ تپاں بن کر دوڑی اور رعد غراں بن کر گرجی ۔ لہٰذا یہ مسئلہ اب مسٹر مسعود اور ارباب بست وکشاد سندھ کا نہیں رہا بلکہ سوال ہو گیا ہے حق وانصاف کی حمایت میں آواز بلند کرنے والی سعید روحوں اور جبروا ستبداد کے پنجۂ آہنی سے اس آواز کو دبانے والے طاغوتی گروہ کا ۔ ہم پوچھتے ہیں حق وصداقت کی تائید کے مدعیوں سے کہ کیا تمہاری موجودگی میں استبداد کا قہرمانی پنجہ یہی کچھ کرتا رہے گا! کیا مظلوم انسانوں کی حمایت میں نکلی ہوئی آواز کو اتنی بھی اجازت نہ مل سکے گی کہ وہ درد آشنا دلوں کے کانوں تک پہنچ سکے! ہم پاکستان کے پریس سے پوچھتے ہیں کہ کیا وہ استبداد کے اس چیلنج کو یونہی بلا استجاب چھوڑ دینگے؟ اس وقت حریت وصداقت اور مظلوم انسانیت آپ کا منہ تک رہی ہے ۔ اور ہم گذارش کریں گے حکومتِ پاکستان کے اربابِ حل وعقد سے کہ وہ مسئلہ کی اہمیت کا احساس کریں اور اس سوال کو مرکز اور صوبہ کے دوائر عمل کے اصطلاحی نقاب سے اوجھل کرکے اپنے آپ کو مطمئن نہ کرلیں ۔ زمیندار اور کاشتکار کا یہ عقدہ اب اس حد تک آپہنچا ہے کہ اگر آپ کے ناخنِ تدبیر نے اس کی گرہ کشائی نہ کی تو کمیونزم کا شعلہ جوالہ اس پر لپکا اور نہ معلوم اس کے ساتھ کیا کچھ جلاکر راکھ کا ڈھیر بنا دے گا!

باقی رہے مسعود صاحب ۔ تو ہم بہ صحیمِ قلب انہیں مستحق ہزار تبریک وتہنیت سمجھتے ہیں کہ انہوں نے ملازمت کی پابندیوں کے باوجود اس طرح کی بے باکانہ حق گوئی سے اس سیرتِ یوسفی کی یاد تازہ کرادی جہاں قیدخانہ کی سلاخوں کے پیچھے ایک خود آگاہ وخدامست آواز نے کہا تھا کہ یٰصاحبی السجن ءاربابٌ متفرقون خیرام اللّٰہ الواحد القہار ۔ اے میرے قیدخانہ کے ساتھیو! کیا یہ اربابِ متفرقہ اچھے ہیں یا خدائے واحد وقہار؟ ہوسکتا ہے کہ اس حق گوئی کے جرم کی پاداش میں مسٹر مسعود کو آزمائشوں میں سے بھی گذرنا پڑے ۔ لیکن ہمیں پوری امید ہے کہ ایسی صورت میں ان کا جواب بھی وہی ہوگا جو ساحرینِ فرعون نے فرعون کی دھمکی کے جواب میں دیا تھا کہ فاقض ما انت قاض ۔ جو تیرے جی میں آئے کر گذر ۔ انما تقضی ھٰذہ الحیوٰۃ الدنیا ۔ تمہارا حکم اسی جہانِ آب وگل کی چاردیواری تک محدود ہے اور زندگی کی فضائیں لا متناہی ہیں ۔ ان تک تمہاری رسائی نہیں ہوسکتی ۔

بہ ترازوئے اندیشہ سود وزیاں ہے زندگی ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی!

[طلوعِ اسلام ہمیشہ شخصیتوں سے بلند رہتا ہے ۔ اس کی تنقید اور تقریظ اصول کے تابع ہوتی ہے ۔

اس لئے "حارث" صاحب کا یہ مضمون، مسعود صاحب کے تعارف کی غرض سے نہیں شائع کیا جا رہا بلکہ اس لئے کہ اس میں ایک اہم اصولی بات سامنے لائی گئی ہے۔ یہ جمہوریت یا حریتِ فکر و آرار کا بنیادی اصول ہے کہ اقلیت کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی اختلافی رائے اکثریت کے علی الرغم پیش کرے۔ حکومتِ سندھ نے مسعود صاحب کی رپورٹ کو دبا کر جمہوریت کے اس اہم اصول کو استبدادِ ملوکیت کے ہاتھوں پامال کر دیا ہے جس کے خلاف ہم اپنی پوری قوت اور شدت سے صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں۔ اور "حارث" صاحب کی ہم نوائی میں پاکستان کے پریس سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ اس احتجاج میں ہمارے شریک ہوں۔ اس اصولی بحث کے بعد، اگر مسعود صاحب کی رپورٹ اس لئے دبا دی گئی ہے کہ اس میں "حارث" صاحب کے اندازہ کے مطابق، کمزوروں کی بے بس ہاریوں کی حمایت کی گئی ہے اور یہ حمایت سندھ کے اربابِ اقتدار کے مفاد کے خلاف ہے، تو حکومتِ سندھ کی یہ حرکت اور بھی مذموم ہو جاتی ہیں۔

"زمیندار اور مزارع" کی نزاع و کشمکش کا مسئلہ بجائے خویش ایک مستقل مسئلہ نہیں بلکہ اس سوال کا ایک اہم گوشہ ہے کہ ہمارا معاشی نظام کیسا ہونا چاہیے۔ یہ سوال طلوعِ اسلام کے سامنے ہے اور اس موضوع پر جب کچھ لکھا جائے گا تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائیگی کہ قرآن کی رو سے آج کس قسم کا معاشی نظام قائم کیا جا سکتا ہے جو دورِ حاضرہ کے بین الاقوامی اقتضات کو بھی پورا کرے اور زندگی کی ان مستقل اقدار کو بھی قائم رکھے جو اصل الاصولِ حیات ہیں۔ اس نظام میں سوال صرف زمین کی انفرادی اور شخصی ملکیت ہی کا نہیں ہوگا بلکہ سرمایہ پرستی کی دوسری شکلوں (مثلاً بڑے بڑے کارخانوں اور جائدادوں کی ملکیت) سے بھی بحث ہوگی۔ افسوس ہمارے ہاں صورت یہ ہے کہ کچھ لوگ تو محض بطور فیشن اپنے آپ کو کمیونسٹ کہلاتے ہیں اور اسے جدت پسندی سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسری طرف قدامت پرستوں کا یہ عالم ہے کہ جونہی کسی نے غریبوں کی ہمدردی میں کوئی بات کہی اس پر کمیونسٹ کا لیبل لگا دیا۔ ان کے بین بین قدیم و جدید کا ایک امتزاجی سیولی ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ہم "اسلامی کمیونزم" کے مدعی ہیں اور نہیں سمجھتے کہ وہ کس طرح دو متضاد اور باہمد گر نقیض تصوراتِ حیات (Ideologies) کو ملا رہے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ کمیونزم اور اسلام کے معاشی نظام میں بعض عناصر مشترک یا باہمد گر مشابہ ہیں لیکن اس اشتراک یا تشابہ سے ان کی اصل ایک نہیں ہو سکتی۔ اصل کے اعتبار سے یہ دونوں نظام بالکل جداگانہ اور مختلف و متبائن بنیادوں پر استوار ہیں جن کا ادغام ناممکن ہے۔ اسلام، انسان کو تماماً و کمالاً سامنے رکھتا ہے اور اس کی معاشی ضروریات اس کی زندگی کے صرف ایک پہلو کے تقاضے ہیں۔ اسلام ایسا نظامِ زندگی عطا کرتا ہے جس میں یہ تقاضے اس انداز سے پورے

ہوتے ہیں کہ ان کی تسکین، شرفِ انسانیت کے نمود و ارتقاء کی راہ میں حائل ہونے کی بجائے اس کے عروج و ارتقاء کے لئے ممد و معاون بنتی ہے۔

لیکن متذکرہ صدر طبقات سے کہیں زیادہ تعجب انگیز اور افسوسناک روش ہمارے اربابِ اقتدار و اختیار کی ہے جنھوں نے آج تک محسوس ہی نہیں کیا کہ وہ اس کے طوفانِ بلاانگیز کو کس شدومد کے ساتھ دعوتِ استبداد دے رہے ہیں۔ پاکستان میں غریب اور امیر طبقات میں تفریق و تمیز اور عوام اور حکمران طبقہ میں بُعد و مغائرت اس درجہ نمایاں اور شدید ہو چکی ہے کہ اگر اس کے حقیقی ازالہ کی جلد کوشش نہ کی گئی تو یہ لاوا کسی کے سنبھالے نہیں سنبھلے گا۔ ہم اس خلا کی طرف جو عوام اور حکومت میں پیدا ہو چکا ہے مسلسل ایک سال سے توجہ دلاتے چلے آرہے ہیں لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس کے پُر کرنے کی کوئی کوشش ابھی تک نہیں کی گئی۔ ہم ایک بار اپنے اربابِ اختیار کو پھر متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ یہاں بعینہٖ وہ حالات پیدا ہو رہے ہیں جن سے کیونزم کی تخریبی قوتیں بڑا فائدہ اٹھایا کرتی ہیں۔ بھوک کی تسکین تصورِ حیات اور اصولِ زندگی کے وعظوں سے نہیں ہوا کرتی۔ عملی اقدام سے ہوا کرتی ہے اور یاد رکھئے کہ یہاں جس قسم کی طبقاتی تقسیم پیدا ہو چکی ہے وہ ان وعظوں کی عملی تغلیط و تضحیک کے لئے کسی خارجی سہارے یا انگیخت کی بھی محتاج نہیں۔ وفی انفسکم افلا تبصرون؟ —— طلوع اسلام)

لمعات

(بقیہ مضمون از صفحہ ۸)

حال ہی میں راشٹریہ سیوک سنگھ نے حکومت ہند کو دھمکی دی تھی کہ وہ یا تو پاکستان کے خلاف جنگ کا اعلان کر دے یا پھر ان پر سے پابندی ہٹالے۔ اس مطالبہ کی عدم منظوری سے سنگھ نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی تھی۔ ۲۱ جنوری کو وہ تحریک غیر مشروط طور پر واپس لے لی گئی ہے۔ کیا سنگھ کو حکومت ہند کے عزائم کا پتہ چل گیا ہے اور انھیں اطمینان ہو گیا ہے؟

ہمارے خدشات واہمہ کی تخلیق نہیں۔ خود ہندوستان کی حرکات ایسے خدشات کو تقویت دے رہی ہیں۔ ۵ جنوری کی قرارداد اخبارات میں شائع ہوئی تو اس سے متعلقہ دستاویزات یعنی وہ تشریحات جو کمیشن نے پاکستان اور ہندوستان کو بہم پہنچائیں اشاعت کے لئے نہیں دی گئی تھیں اور خیال تھا کہ وہ بعد میں موزوں وقت شائع کی جائیں گی۔ اس اخلاقی پابندی کے باوجود ہندوستان کی طرف سے نہرو کی دو یادداشتیں اخبارات میں "بلا اجازت" چھپ گئیں۔ حیران کن امر یہ ہے کہ ۲۱ جنوری کو یہ یادداشتیں مدارس کے روزنامہ "ہندو" مصنف

شائع کیں اور دوسرے دن انھیں حکومت ہندوستان نے باقاعدہ اشاعت کے لئے دیدیا۔ ان یادداشتوں میں کوئی غیر معمولی فیصلہ نہیں تھا جس کی اشاعت سے خاص مقصد حاصل ہوتا ہو یا حکومت ہندوستان کو کسی قسم کا فائدہ پہنچتا ہو۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہرو صاحب اکیلے بیٹھے ہوئے بلند آواز سے باتیں کر رہے ہیں اور انھوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سامنے ڈاکٹر لوزانو بیٹھے ہیں۔ لیکن یہ "بلا اجازت" اشاعت بے وجہ نہیں ہوسکتی۔ کم از کم یہ خلاف عہد ہے اور آئندہ اس ذہنیت سے خطرناک نتائج برآمد ہوسکتے ہیں۔ ان یادداشتوں میں البتہ یہ امور قابل ذکر ہیں:۔

(۱) مسٹر نہرو نے بہت زور صرف کر کے یہ ثابت کیا کہ استصواب ناقابلِ عمل ہے، لہذا کوئی متبادل صورت تلاش کرنی چاہیئے۔

(۲) آزاد کشمیر کی فوجوں کو منتشر کرنے کے بعد ریاست میں ہی رہنے دیا گیا تو استصواب آزادانہ نہیں ہو سکیگا کیونکہ ان کی موجودگی ان عناصر کو پریشان کریگی جو الحاق پاکستان کے خلاف ہوں گے۔

(۳) اس سوال کا فیصلہ کہ باہر سے آنے والے جائز ضرورت کے لئے آئے ہیں یا نہیں ریاست جموں وکشمیر کی حکومت کو کرنا چاہیئے۔

(۴) جب تک پاکستان اپنا معاہدہ پورا نہ کرے اس وقت تک ہندوستان پر کسی قسم کی ذمہداری نہیں ڈالنی چاہیئے۔

(۵) چونکہ ریاست میں ہزاروں آدمیوں کو واپس لانا ہے اس لئے استصواب کے انتظامات جلدی مکمل نہیں ہو سکینگے۔

یہ وہ تنقیحات ہیں جو وزیر اعظم ہندوستان کی اختراعات دماغ ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ پاکستان کے لئے قابل قبول نہیں ہوسکتیں۔ خود کمیشن نے انھیں تسلیم نہیں کیا۔ کم از کم یادداشتوں سے یہ پتہ نہیں چلتا۔ نیز جو مصدقہ دستاویزات شائع ہوئی ہیں ان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھیں تسلیم کر لیا گیا ہے۔ بلکہ وہ ان کے خلاف ہیں۔ اگر ان یادداشتوں کی حیثیت یہی کچھ ہے تو ان کی اشاعت کی سعی عبث کیوں؟ عین ممکن ہے کہ قوی اندرونی عناصر کو جو استصواب کے تصور سے کانپ اٹھتے ہیں، خاموش کرنے کے لئے حکومت ہندوستان نے اپنی ذہنی رو کو بے نقاب کرنا مناسب سمجھا ہو تاکہ وہ یہ بھانپ جائیں کہ حکومت نے استصواب کا فیصلہ یونہی نہیں مانا۔ بلکہ وہ اسے ناقابل عمل سمجھتی ہے اور ناقابلِ عمل بنا کے رہے گی، یا ناقابل عمل نہ بنا سکی تو مشکلات کھڑی کر کر کے اسے التوا میں ڈالتی جائے گی۔ التوا مفید ہو سکتا ہے، کیونکہ جب بھی عسکری نقطۂ نگاہ سے سازگار فضا پیدا ہوئی عہد توڑ کر طرح جنگ ڈالی جا سکتی ہے۔ ہندوستان بیرون ملک پروپیگنڈہ کے لئے امن پسند اور غیر جنگجو ہونے کا دعویٰ باندھ رہا ہے، اور اندرونِ ملک وہ مختلف انداز سے بات کر رہا ہے۔ یہ فضا کسی وقت عہد و پیمان توڑنے کا باعث بن سکتی ہے۔ یوں بھی ہندوستان کے متعلق ایفائے عہد کا تجربہ خوشگوار نہیں۔ وہ بہ رو بہ بہت سے وعدے کر لیتا ہے، مگر ایفا میں ہزار حجتیں پیش کرتا ہے اور حیلے تراشتا ہے۔ کشمیر کے معاملہ میں اسے ڈھیل نہیں دی جا سکتی۔ یہ سنگین مسئلہ ہے اور اس کے تباہ کن نتائج ہو سکتے ہیں!

استصواب کی تیاری کے لئے تحریر و تقریر کی آزادی ازبسکہ ضروری ہے۔ نیز ہر قسم کی غیر آئینی پابندیاں جو دوگرہ راج کا طغرۂ امتیاز ہیں یک قلم کالعدم ہو جانی چاہئیں۔ یہ غنیمت ہے کہ کمیشن نے اس کے لئے مناسب گنجائش رکھدی ہے لیکن عملاً اس شرط کو ناکارہ بنایا جاسکتا ہے، اور فریق ثانی جس قسم کی حرکات مذبوحی کا مظاہرہ کر رہا ہے اس سے یہ بعید بھی نہیں۔ لہٰذا یہ احتیاط بھی برتنی ہوگی کہ فریق ثانی کوئی ایسا اقدام نہ کرسکے اور اگر وہ کرے تو اس کا مناسب تدارک ہوسکے۔

استصواب کے سلسلہ میں ایک اہم امر کو ہمیں بھولنا نہیں چاہئے۔ محض بھولنا نہیں بلکہ اسے خصوصیت سے اجاگر کرنا چاہئے۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہزاروں کشمیری مسلمان تہ تیغ کئے جاچکے ہیں، اور ہزاروں گھربار چھوڑ دینے پر مجبور کردیئے گئے ہیں۔ ہندوستان سے کثیر تعداد میں غیر مسلم کشمیر میں بسائے جاچکے ہیں۔ اس سے رائے شماری پر لامحالہ اثر پڑیگا۔ اس کے علاوہ عام طور پر یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ جموں کے علاقہ میں مسلمانوں کی اقلیت ہے۔ اس غلط مفروضہ سے تقسیم کشمیر کا مردود سوال بھی بعض ذہنوں میں آنا شروع ہوگیا۔ یہ غنیمت ہے کہ شائع شدہ دستاویزات میں تقسیم کا کہیں ذکر نہیں۔ استصواب میں ریاست کو ایک کل قرار دیا گیا ہے۔ لیکن اگر ہندوستان نے مشکلات پیدا کردیں اور اسے ناقابل عمل بنانے کے مذموم ارادے سے تاخیر پیدا کرنے میں کامیاب ہوگیا تو کسی مرحلہ پر تقسیم کا فتنہ سر اٹھاسکتا ہے۔ بین الاقوامی ثالث اپنی نجات اسی میں سمجھیں گے کہ وہ تقسیم کراکے ہی اس خارزار سے نکل جائیں۔ اندریں حالات یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی مردم شماری کے صحیح اعداد و شمار عام طور پر شائع کئے جائیں تاکہ کوئی متعلقہ شخص اس سے متعلق غلط فہمی میں مبتلا نہ رہے۔ آخری مردم شماری ۱۹۴۱ء میں ہوئی تھی۔ اس کے اعداد و شمار درج ذیل ہیں۔ واضح رہے کہ کشمیر تین انتظامی حصوں میں منقسم ہے۔

	کل آبادی	مسلمان	غیر مسلمان[1]
صوبہ جموں	۱۹,۸۱,۴۳۳	۱۲,۱۵,۶۷۶	۷,۶۵,۷۵۷
صوبہ کشمیر	۱۷,۲۸,۷۰۵	۱۶,۱۵,۴۷۸	۱,۱۳,۲۲۷
صوبہ سرحد	۳,۱۱,۴۷۸	۲,۷۰,۰۹۳	۴۱,۳۸۵
	۴۰,۲۱,۶۱۶	۳۱,۰۱,۲۴۷	۹,۲۰,۳۴۹

یہ اعداد و شمار اس مردم شماری کے ہیں جو حکومت ہند کے زیر نگرانی ہوئی تھی اور جس کے ریکارڈ اس کے ہاں محفوظ بھی ہیں۔ یہی آخری مردم شماری ہے اور اسی کو استصواب کی رائے شماری کی اساس ہونا چاہئے۔

ہم پھر دہراتے ہیں کہ التوائے جنگ بجائے خود کامیابی ہے لیکن یہی کامیابی نہیں۔ اصلی کامیابی استصواب کی کامیابی ہے اور اس کی "جنگ" ہنوز شروع نہیں ہوئی۔ کہا نہیں جاسکتا کہ اس وقت تک مذاکرات کیا رنگ اور مسائل کیا نوعیت اختیار کرگئے ہیں۔ ہمیں ایک طرف استصواب کی تیاری پوری مستعدی سے کرنی چاہئے اور

[1] غیر مسلمانوں میں ہندو، اچھوت، سکھ، جین اور بدھ سب شامل ہیں۔

دوسری طرف اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ یہ بظاہر امن کی فضا خوفناک تر جنگ کا پیش خیمہ ہو سکتی ہے۔ اگر فریق ثانی امن و صلح پر صمیم قلب آمادہ ہے، تو ہم امن کے جملہ تقاضے پورے کریں گے اور اگر وہ نقص امن کرنا چاہتا ہے تو ہمیں غافل نہیں رہنا چاہئے۔

کشمیر کی کثرت آبادی مسلمان ہے اور یہ بآسانی فرض کیا جا سکتا ہے کہ وہ پاکستان سے ہی الحاق پسند کرے گی۔ یہ مفروضہ ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن پاکستان کے لئے ضروری ہے کہ وہ باشندگان کشمیر کے مسلمان ہونے پر ہی غیر معمولی اعتماد نہ کرے بلکہ عمل سے بتائے کہ وہ پاکستان میں محفوظ و خوشحال ہوں گے۔ اور ان کے دور غلامی و ظلم کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ابھی تک پاکستان نے پاکستانی ریاستوں کے نظام میں خاطر خواہ طریقہ سے اصلاح نہیں کی۔ خود پاکستانی عوام ارباب حکومت سے کما حقہٗ مطمئن نہیں۔ عمل کی اپیل الفاظ سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ اگر پاکستان اپنے عمل سے ثابت کر دے کہ پاکستان اور پاکستانی ریاستوں میں عوام کا درجہ بلند ہوگا اور انسانی حقوق کا کما حقہ تحفظ ہوگا تو اس عملی مثال کا مسلمانانِ کشمیر پر بہت اچھا اثر پڑے گا۔ وہ خود بخود کھچے چلے آئیں گے۔ استصواب کے انعقاد میں کافی دیر ہے اور اس وقفہ میں پاکستان کے پاس سنہری موقع ہے کہ وہ نظم و نسق میں اس نہج کی اصلاح کرے کہ استصواب میں رائے دینے والے مجبور ہو جائیں کہ پاکستان سے ہی الحاق کریں۔

انتخاباتِ پنجاب

پنجاب کی سیاست قومی اعتبار سے ۱۹۳۵ء سے ہی کہ اصلاحات ۱۹۳۵ء کے مطابق پہلی نمائندہ وزارتوں نے صوبجاتی نظم و نسق سنبھالا ایسی نہج پر چلنا شروع ہو گئی تھی کہ صوبجاتی ترقی اور عوامی ترفیع کیلئے وہ چنداں خوش آئند نہیں تھی۔ حضر وزارت کے برسر اقتدار آنے سے اس نہج میں تو کیا تبدیلی واقع ہوتی البتہ نظم و نسق حکومت کا پہلا وقار بھی ضائع ہو گیا۔ قیام پاکستان کے بعد جب صوبائی عنان اقتدار نمائندگان مسلم لیگ بلکہ صوبائی مسلم لیگ کے صدر خان ممدوٹ، اور ان کے رفقائے لیگ کے سپرد ہوئی تو صوبائی نظم و نسق بازی گاہ طفلاں بن کے رہ گیا۔ اس وزارت نے انتظام حکومت کو اس قدر فاسد و مسموم بنا دیا کہ فساد و سم کی اس سے بدتر مثال شاید ہی ڈھونڈے سے مل سکے۔ ہم نے اشاعت جنوری میں اس فساد عظیم پر تبصرہ کرتے ہوئے مرکز سے مطالبہ کیا تھا کہ "وزارت اور اسمبلی دونوں کو توڑ دیا جائے اور صوبائی نظم و نسق گورنر کو سونپ دیا جائے"۔ اس تحریر کی روشنائی بمشکل ختم ہو پائی تھی کہ مرکز نے عوامی فریاد کو سن لیا اور ان کی مدد کو آ پہنچا۔ چنانچہ مغربی پنجاب کی وزارت اور مجلس مقننہ کو توڑ کر انصرام حکومت گورنر کو سونپ دیا گیا "گورنر راج" اس وقت تک باقی رہے گا جب تک نئے انتخابات نہیں ہو جاتے اور گورنر آئینی وزراء مقرر نہیں کر لیتا۔ ہم گورنر جنرل کی خدمت میں اس جرأت اقدام پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے صوبہ بھر کو ایک لعنت سے نجات دلا دی ہے۔

ممدوٹ وزارت کا کم و بیش اٹھارہ مہینوں کا ننگ صوبہ، ننگِ وطن اور ننگِ سیاست دور آخر کار ختم ہوا۔ اٹھارہ قیمتی مہینوں میں مغربی پنجاب اور پاکستان کی بیش بہا خدمات سرانجام دی جا سکتی تھیں، لیکن یہ جمہوری نمائندے مفاد ملت کو پس پشت ڈال کر شخصی تفوق اور ذاتی غلبہ کے تحفظ و بقا کی سازشوں میں الجھے رہے۔ یہ طائفہ غداراں

جسے مسلمانانِ پنجاب نے زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگا لگا کر اپنا واحد نمائندہ بنایا تھا ان پر کابوس بن کر مسلط ہو گیا۔ مقام امتنان ہے کہ صوبہ کو اس کابوس سے نجات مل گئی ہے اور قدرت نے اہلِ پنجاب کو سنہری موقع عطا کیا ہے کہ وہ صوبہ کی عنانِ قیادت حسبِ خواہ بدل لیں۔ لیکن پنجاب کے ووٹروں کو جہاں یہ سنہری موقع عطا ہوا ہے وہاں ان پر ایک نازک ذمہ داری بھی آپڑی ہے۔ رائندہ وزارت کے خلاف ان کی شکایات مسلّم لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ انہی کے ووٹوں سے صوبہ پر مسلط ہوئی تھی۔ لہٰذا اب نہ محض ان آزمائے اور ٹھکرائے ہوؤں کو پھر سے مسانید اقتدار پر مسلط نہ ہونے دیا جائے بلکہ آئندہ کے لئے ان کو منتخب کیا جائے جو جذباتِ خدمت سے سرشار ہوں اور دولت عمل سے مالا مال۔

ووٹ ایک قیمتی متاع ہے۔ ملک و ملت کا مستقبل اس کے طریق استعمال سے وابستہ ہے۔ آپ کے پاس کافی وقت ہے۔ گرد و پیش نگاہ دوڑائیے۔ ان مردانِ جفاکش کو تلاش کیجئے اور ابھاریئے جو جد و جہد حیات کے سنگین تقاضوں کو پورا کرنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے صوبے کا نظم و نسق فساد سے پاک رہے تو ان کے حق میں ووٹ دیجئے جو آپ کے حیات و خیالات کی نمائندگی کریں نہ کہ ان کے حق میں جو آپ پر حکومت کرنے میں ساعی رہیں۔

ووٹروں کے بعد ہماری عرض مسلم لیگ سے ہے۔ جن ارکان وزارت اور ارکان مجلس مقننہ کو آج بیک بینی و دوگوش نکال باہر کر دیا گیا ہے یہ وہی بزرگ ہیں جن کی کامیابی پر مسلم لیگ نے فتح کے شادیانے بجائے تھے اگر ان کی کامیابی مسلم لیگ کی کامیابی تھی تو ان کی ناکامی اور نامرادی بھی مسلم لیگ کی ناکامی اور نامرادی ہے۔ رائندہ مقننہ میں مسلم لیگ قدیم کے ہی نمائندگان نہیں تھے، بلکہ اس میں مسلم لیگ جدید کے تو منتخب ارکان بھی تھے۔ دونوں نے جو مظاہرہ کیا وہ شرمناک داستان ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہونے والے انتخابات میں مسلم لیگ کی پوزیشن کیا ہوگی، اور وہ ان سے کیسے عہدہ برآ ہوگی؟ کیا وہ بدستور سابق اپنے نامزدگان کو مختلف حلقوں سے کھڑا کرے گی؟ اس وقت مسلم لیگ کے علاوہ کوئی سیاسی پارٹی میدان میں نہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ انتخابات کے اعلان سے نئی پارٹیاں معرضِ وجود میں آجائیں گی یا نہیں۔ اگر کوئی نئی پارٹی بن بھی جائے تو اس کے پاس فضا سازگار کرنے کیلئے مطلوبہ وقت نہیں ہوگا۔ اس لئے بظاہر نئی سیاسی پارٹیوں کا قافیہ تنگ نظر آتا ہے۔ اگر اس صورت میں مسلم لیگ نے نامزدگیوں سے کام لیا تو انتخابات نامزدگیوں سے زیادہ وقیع نہیں ہوں گے۔ چونکہ مسلم لیگ کا حریف کوئی نہیں ہوگا۔ لہٰذا جسے بھی مسلم لیگ نامزد کر دیگی وہ "بلا مقابلہ" منتخب ہو جائیگا۔ اسی اشاعت میں دوسری جگہ ہم نے بتایا ہے کہ مسلم لیگ کی تنظیم جدید خاطر خواہ نہیں ہوئی اور بہت سے اصحاب غرض و ابنائے وقت نے اس کی ہر دلعزیزی کے دامن میں پناہ لے لی ہے۔ اندریں حالات ملت ایک نااہل اور غرض پرست گروہ چھٹکارا حاصل کر کے دوسرے نااہل اور غرض پرست گروہ کے چنگل میں پھنس جائیگی اور قوم کا اہل طبقہ منظرِ عام پر نہیں آسکے گا۔ لہٰذا مسلم لیگ سے ہماری یہ درخواست ہے کہ مغربی پنجاب کے انتخابات کو ایک پارٹی کے انتخابات کا تماشہ نہ بنا دے۔ بالفاظ صحیح تر یہ انتخابات کسی

پارٹی کے نام پر نہ لڑے جائیں۔ مسلمانانِ مغربی پنجاب کو آزاد چھوڑ دیا جائے کہ وہ جسے چاہیں نمائندہ چن لیں۔ ہر حلقہ میں ہر اہل امیدوار کو آزادانہ ذاتی جوہر کے بل بوتے پر انتخابات میں مقابلہ کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے تاکہ ہر حلقہ کے ووٹر ہر امیدوار کو اس کی ذاتی اہلیت و استعداد کی بنا پر منتخب کریں اور اس کی خوبیوں یا خامیوں کا اندازہ اس کی سیاسی وابستگی سے نہ لگائیں۔ مسلم لیگ کے لئے یہ آزمائش کا موقع ہے۔ اگر وہ اپنے جھوٹے وقار کے خیال بیہودہ میں الجھ گئی تو صوبہ پھر سے بدنظمی کا گہوارہ بن جائے گا۔ اسے چاہیئے کہ وہ صوبہ کو اپنے حال پر چھوڑ دے۔

سب سے آخر میں ہم چند گذارشات حکومت یعنی گورنر اور گورنر جنرل صاحب کے حضور بھی کرنا چاہتے ہیں۔ جس عمارت کو اب گرا دینا ضروری سمجھا گیا ہے یہ وہی عمارت ہے جسے جگہ بہ جگہ ستون نصب کر کے برقرار رکھنے کی کوششیں ہوتی رہیں اور بالآخر معلوم ہوا کہ اس بوسیدہ عمارت کا یوں برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ درحقیقت یہ خرابی اس عمارت کی نہیں بلکہ ان بنیادوں کی ہے جن پر یہ عمارت استوار تھی۔ یہ بنیادیں اس بوسیدہ عمارت سے کہیں زیادہ کھوکھلی ہیں۔ اب جبکہ آپ نے اتنی ہمت کی ہے کہ عمارت کو گرا دیا ہے تو لگے ہاتھ ان بنیادوں کا بھی جائزہ لے لیجئے جن پر یہ قائم تھی۔ یہ تو ہم کسی فرصت کے وقت عرض کرینگے کہ صحیح بنیادیں کونسی ہو سکتی ہیں جن پر پائندہ عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ فی الحال اسے نہ بھولئے کہ انگریز نے اپنے عہدِ حکومت میں اپنے سیاسی مصالح کی بنا پر پنجاب اسمبلی کے انتخابی حلقوں کا ایسا تعین کیا کہ اسمبلی کی بھاری اکثریت بڑے بڑے زمینداروں اور شہر کے سرمایہ داروں کا اجارہ بن کے رہ گئی۔ یہی وجہ ہے کہ پنجاب عوامی نمائندوں سے محروم رہا۔ اب جبکہ وزارت اور اسمبلی توڑ دی گئی ہیں اور نئے انتخابات کا فیصلہ بدیں وجہ کیا گیا ہے کہ اہل پنجاب کو صحیح قسم کے نمائندے منتخب کرنے کا موقع دیا جائے تو ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ انتظامی سنگ راہ بھی ان کے راستہ سے ہٹا دیا جائے۔ انتخابات کے ضمن میں بہت کچھ تیاری کرنی ہوگی۔ ایک تو ہندو اور سکھ اس علاقے سے نقل مکانی کر گئے ہیں، دوسرے ہندوستان کے مہاجر مسلمان کثیر تعداد میں آکر آباد ہو گئے ہیں۔ اندریں حالات لامحالہ حلقوں کی تقسیم جدید کرنی پڑیگی۔ لہٰذا ہم حکومت سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ انتخابی حلقوں کی از سر نو حد بندی اس اصل پر کرے کہ اہل پنجاب کو موقع مل جائے کہ وہ عوامی نمائندے منتخب کر کے اسمبلی میں بھیج سکیں تاکہ عوام کی مشکلات کا کوئی حل ہو سکے۔ صحیح قیادت کو بروئے کار لانے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ نہ تو امیدواروں کیلئے کوئی خصوصی شرطیں ہوں اور نہ ووٹروں کیلئے۔ ہر بالغ و عاقل کو امیدوار کھڑا ہونے اور رائے دینے کا پورا پورا حق حاصل ہونا چاہیئے۔

انتخابات کے ضمن میں دوسرا اہم سوال کشمیر کا ہے۔ اس وقت کشمیر کا استصواب بھی درپیش ہے۔ کشمیر کا استصواب پنجاب کے انتخابات پر مقدم ہے۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ وقت اور توجہ استصواب کشمیر کی تیاری پر صرف کرنی چاہیئے۔ اس کیلئے اشد ضروری ہے کہ اہل پنجاب کو کسی اور ہنگامہ میں الجھنے نہ دیا جائے۔ اگر پنجاب انتخابات میں الجھ گیا تو وہ کشمیر کی طرف مطلقاً توجہ نہیں دے سکیگا۔ لہٰذا ہم گورنر اور گورنر جنرل سے گذارش کرتے ہیں کہ وہ انتخابات کی تاریخیں استصوابِ کشمیر کے بعد رکھیں۔ اس دوران میں سرکاری طور پر مناسب اور ضروری تیاری کی جا سکتی ہے۔ مثلاً حلقوں کی تقسیم جدید، ووٹروں کی فہرستوں کی ترتیب وغیرہ۔ لیکن کوئی ایسا اقدام نہیں کرنا چاہیئے جو عوام کی توجہ کشمیر سے پھیر کر ادھر الجھا دے۔